چہرہ

رُوح کی لطافتوں کو چھو لینے والی چشم کشا تحریر

مصنف

امجد جاوید

علم و عرفان پبلشرز

34-اردو بازار، لاہور فون: 042-7352332-7232336-8405100

نام کتاب .... چہرہ (ناول)

مصنف .... امجد جاوید

سن اشاعت .... ستمبر 2005ء

قیمت .... 150 روپے

انتساب

استادِ محترم

جناب اختر حسین شیخ

کے

نام

''خاموش چہرہ، خاموش لفظ کی طرح، صاحب نظر انسان کے سامنے بولتا ہے۔خاموشی خود گویا ہوتی ہے۔صاحب نظر سکوت سے ہم کلام ہوتا ہے۔ اس پر عجیب عجیب انکشاف ہوتے ہیں۔ اس پر راز ہائے سربستہ کھلتے ہیں۔اس پر افکار عالیہ کا نزول ہوتا ہے۔اس پر پرانے اسماء کے نئے معنی اپنی نئی جہتوں اور نئی صورتوں کے ساتھ اترتے ہیں۔اس کے لئے علامات کا در ایسے وا ہوتا ہے کہ وہ رموز مرگ و حیات سے باخبر ہوتا ہے۔اس کی زندگی میں ہونا اور نہ ہونا مسلسل ہوتا رہتا ہے۔''

واصف علی واصف..... دل دریا سمندر

سوچ کے بند دروازے پر دستک

سچ پوچھئے تو اب شدت سے یہ احساس ہوتا ہے کہ کہانی لکھنا اکثریت کی نظر میں دو اور دو چار والا معاملہ بن کر رہ گیا ہے۔ یہاں اب بہتات ان کی ہے، جنہیں لفظوں کی مالا پرونے کا ہنر تو آتا ہے لیکن سعی کے وہ قائل نہیں اور سطحی سی نظر رکھتے ہیں۔ یہ سہولت شاید اس لئے بھی لکھنے والوں کو مل گئی ہے کہ جب سے زندگی جدیدیت کے وائرس میں مبتلا ہوئی ہے، ہر شخص کی ذات سے ایک کہانی وابستہ ہے اور دو اور دو چار والی بات یوں صادق آتی ہے کہ لکھنے والے کو اب کرداروں کی کھوج نہیں کرنی پڑتی، تیز رفتاری نے یہاں ادب کو بھی متاثر کیا ہے اور انجام کے لئے لکھنے والے کو سوچنا نہیں پڑتا، ایک منطقی انجام بہت جلد سامنے آ جاتا ہے۔ میری نظر میں تو اسے کہانی نہیں میزانیہ کہہ لینا چاہیے جبکہ ادب برائے زندگی کے نعرہ کو تسلیم کیا جائے تو مان لیجئے کہ زندگی تو راستی کا نام ہے۔ جو سکون سے بسر ہو، زندگی اسے ہی کہتے ہیں اور شانت زندگی گذارنے کے لئے رہنمائی کی ضرورت ہر قدم پر رہتی ہے۔ اب سوچ کا عمل ہماری زندگی سے خارج ہو رہا ہے اور ضرورت اس امر کی ہے کہ اسے واپس لایا جائے یہ کام وہی کر سکتا ہے جو ادب برائے زندگی کا قائل ہو۔ امجد جاوید کی یہ خصوصیت قابل داد ہے کہ وہ اپنی تحریروں میں حالات و واقعات اور کرداروں کے ذریعے قاری کی سوچ کے بند در پر دستک دیتے ہیں۔ ان کی تحریر پڑھ کر قاری کو شدت سے احساس ہوتا ہے کہ اس کی سوچ کا در کھلا ہے تو اُجالوں کی جانب دیکھنے کی ضرورت بھی اسے محسوس ہوتی ہے۔ پڑھنے

والے کو اس زعم میں مبتلا کرنا ہی ایک قلم کار کی سب سے بڑی خوبی ہے......اور امجد جاوید میں یہ خوبی اپنی انتہا تک ملتی ہے۔امجد جاوید نے شعور کی آنکھ کھولنے کے بعد، لگتا یہی ہے کہ پھر پلک تک نہیں جھپکی اور یہی وجہ ہے کہ اپنی تحریروں کے باعث قاری کے ذہن میں ہی نہیں، اس کے دل میں بھی اپنے لئے جگہ بنا لیتے ہیں۔

صحرائے چولستان کی شمالی انتہا اور دریائے ستلج کی جنوبی نشیب کے اتصال پر آباد شہر باسی......امجد جاوید کی تحریروں اور شخصیت میں بھی صحرا اور دریا کا خوبصورت اور ولولہ انگیز امتزاج زندگی کا ایک نیا انداز ہمارے سامنے لاتا ہے، جو بلاشبہ متاثر کرتا ہے۔

خالد بن حامد

مدیر اعلیٰ۔ ماہنامہ آداب عرض۔ لاہور

رات کا پہلا پہر وقت کی پہنائیوں میں تحلیل ہوا تو دوسرا پہر لوبان کی مانند سلگنے لگا۔ پراسرار سناٹا، خوشبو کی مانند پورے ماحول میں سرایئت کر گیا تھا۔ وہ اپنے تئیں ساری دنیا سے رابطے ختم کر کے لان کے اس گوشے میں بید کی کرسی پر براجمان تھا جو قدرے تاریک تھا مگر تاریکی اُسے نگلنے کی کوشش میں ناکام ہو کر ہانپ رہی تھی۔ آس پاس کے بنگلوں میں سے روشنی ارد گرد موجود درختوں سے چھن کر آ رہی تھی، جس سے اس کا ہیولا واضح ہو رہا تھا۔ اس نے اُجلا سفید کاٹن شلوار سوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ کرسی پر ٹانگیں پھیلا کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور دونوں ہاتھ گود میں پڑے ایک دوسرے کو یوں تھامے ہوئے تھے جیسے وہ دونوں ہی مضبوط سہارا چاہتے ہوں۔

بارش ہو جانے کے بعد موسم کی ادا بڑی حد تک کیف آور ہو گئی تھی۔ مٹی کی مہک اور رات کی رانی کی خوشبو ایک دوسرے میں جذب ہو کر وجد آفریں احساس دے رہی تھی، جیسے کوئی شاعر اپنا لکھا ہوا گیت خود ہی پورے جذب سے گا رہا ہو۔ بھیگے ہوئے پتوں پر پڑنے والی روشنی سے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے ستارے اس کے لئے زمین پر اُتر آئے ہوں۔ مگر وہ ان ستاروں کی جھلملاہٹ سے بے نیاز آنکھیں بند کئے اپنے ارد گرد پھیلی ہوئی خاموشی کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ لمحوں کا اسیر نہیں ہونا چاہتا تھا مگر یہ باتیں کرتا ہوا سناٹا، اس کے من میں اُتر کر ایسا شور برپا کر رہا تھا کہ جس شور میں آوازیں نہیں ہوتیں محض احساس ہوتا ہے، آوازوں کا۔ اس نے اپنے اندر جھانکا تو اسے یوں لگا جیسے وہ جذبات سے تعمیر کردہ محل میں آ گیا ہو، جہاں کی زبان لفظ نہیں احساس ہوتے ہیں۔ اسے یہ آگاہی بڑی من موہنی لگی اور سناٹے کی انتہائی کشش اس سے لپٹنے لگی۔ ان ساعتوں

میں وہ نہیں چاہ رہا تھا کہ کوئی بھی سوچ اس ماحول کی سحر انگیزی کو ختم کر کے رکھ دے۔اس کا دل چاہ رہتا تھا کہ یہ پراسرار طلسم کبھی نہ ٹوٹے اور وہ یونہی آنکھیں بند کئے اس بولتے ہوئے سناٹے میں ضم ہوتا چلا جائے یا پھر باہر کا سارا ماحول اس کے اندر تحلیل ہو جائے۔

اس ماحول سے وہ بڑا پرسکون ہو گیا تھا۔اُسے اپنا وجود بڑا ہلکا پھلکا محسوس ہو رہا تھا۔اک مستی اور سرشاری والی کیفیت تھی۔اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اپنے من میں اُتر جانے والی راہ پر نکل پڑا ہے۔اس وقت اسے بڑی خوشی محسوس ہوئی تھی،جب اس نے تھوڑی دیر پہلے ذہن میں زبردستی آنے والی سوچ کو دھکیل کر خود سے الگ کر دیا تھا۔ یہی وہ سوچ تھی جس نے اسے دو دن سے افسردگی میں مبتلا کیے رکھا تھا اور وہ اس سوچ کے بوجھ تلے پڑا سسکتا رہا تھا۔

بلاشبہ ایسی سوچ سے نجات اس کی کامیابی تھی۔اس کی اپنی مرضی سے حاصل ہونے والی پہلی کامیابی۔ ان دو دنوں کے دوران وہ نجانے کیسی کیسی سوچوں اور نئے نئے خیالوں سے متعارف ہوا تھا۔وہ منتشر ہو کر رہ گیا تھا اور باغیانہ سوچ نے تو اسے یکسر بدل کر رکھ دیا تھا۔اس کی سوچوں کا محور خود اس کی اپنی ذات تھی۔ اس نے اپنے آپ کو جاننے کی کوشش کی۔ اپنا سراغ لگانے کی لذت وہی جانتا ہے جس نے عملی تجربہ حاصل کیا ہو۔ کیونکہ سچائی بھی تو تجربے کی محتاج ہوتی ہے اور آزمائش تجربے کی شرط ہے۔

اس نے جو بھی سوچا بڑی آزادی سے سوچا۔ اس کے باغیانہ خیال اسی بوجھ کا ردعمل تھے جو دو دن پہلے اس پر مسلط ہو گیا تھا۔ وہ اچھی طرح سمجھتا تھا کہ جب سوچیں بے لگام ہو جائیں تو پھر انسان کے اندر ٹوٹ پھوٹ کا عمل شروع ہو جاتا ہے اور یکسوئی نہیں رہتی جبکہ یکسوئی کامیابیوں کے لئے بنیادی عنصر کی حیثیت رکھتی ہے۔

افسردگی میں مبتلا کر دینے والی بوجھل سوچوں کی بنیاد ایک چھوٹا سا واقعہ تھا۔ اس کے ننھیال میں بڑے ماموں فیروز کے بیٹے اشعر اور منجھلے ماموں شکور کی بیٹی فاخرہ کی شادی تھی۔ جن دنوں انہیں دعوت نامے ملے، ان دنوں اس کے ایم بی بی ایس فائنل کے امتحان چل رہے تھے۔ ماما نے جھٹ حساب لگایا کہ اس کے امتحان کب ختم ہو جائیں گے اور وہ اطمینان سے شادیوں میں شرکت کے لئے جا سکے گی۔ وہ بہت پہلے کہیں لڑکپن

میں اپنے ننھیال گیا تھا۔ پھر پڑھائی کی مصروفیات میں وہ کہیں بھی نہ جا سکا تھا۔ان شادیوں میں خوب ہلا گلا ہونا تھا۔اس کے دل میں خواہش اُبھری کہ وہ بھی جائے۔ تمام رشتہ دار ہوں گے،وہ ان سے ملے گا،نانی اماں سے ملے گا جو اسی محلے میں چھوٹے ماموں غفور کے ساتھ رہتی تھیں، شادی کے ہنگامے دیکھے گا، خوب لطف اندوز ہو گا اور امتحانوں کی ساری بوریت ختم ہو کر رہ جائے گی۔ اس نے اپنی خواہش کا اظہار اپنی ماما سے کیا تو ماما نے کسی بھی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔وہ بھی مطمئن تھا کہ امتحانوں کے بعد کوئی ایسی وجہ نہیں ہو گی کہ وہ جا نہ پائے گا۔ لیکن اس کے ماما اور پاپا جس اگلی صبح جانے والے تھے، اسی رات کھانے کی میز پر اسے معلوم ہوا کہ وہ نہیں جا رہا ہے۔

’’ماما جی۔! میں کیوں نہیں جا رہا؟‘‘

اس نے حیرت سے دریافت کیا۔

’’بیٹے، آج ہی تو تمہارے امتحان ختم ہوئے ہیں۔تمہارا ذہن تھکا ہوا ہو گا۔ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔تم گھر پر رہ کر خوب آرام کرو۔‘‘

ماما نے انتہائی محبت سے حکم سنا دیا تو اسے قطعاً اچھا نہیں لگا لیکن وہ اپنی کیفیت کا اظہار کرنے کی بجائے خاموش رہا۔ تبھی پاپا نے مزاحمت کرتے ہوئے کہا۔

’’بیگم!میرا خیال ہے یہ وہاں جا کر فریش ہو جائے گا۔ اب یہ بچہ تھوڑی ہے، جوان ہو چکا ہے سب سے ملے گا،لطف اندوز ہو گا اور یہ تمہاری ذہن تھکنے والی منطق بھی نرالی ہے۔میں نہیں سمجھتا کہ.....‘‘

’’مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ آپ کیا سمجھتے ہیں۔جبکہ میں جانتی ہوں کہ یہ تھکا ہوا ہے اور اسے آرام کی ضرورت ہے۔ مجھے پتہ ہے کہ یہ کس طرح فریش ہو گا۔ رشتے داروں سے ملنا ہے تو بعد میں اطمینان سے جا کر مل لے گا۔‘‘

ماما نے تیز لہجے میں کہتے ہوئے اس مزاحمت کو اپنے فیصلے تلے دبا دیا۔

’’اصل میں اسے فریش ہونے کے لئے کسی پہاڑی مقام پر جانا چاہئے۔ لیکن اس کی خواہش ہے کہ ان شادیوں میں شریک ہو جائے تو کیا حرج ہے؟ میں تو کہتا ہوں کہ یہ زیادہ اچھا ہے تم ماں بیٹا چلے جاؤ۔‘‘

پاپا نے ایک دوسری طرح اپنی بات کہنا چاہی۔

"آپ کو تو بس کوئی نہ کوئی بہانہ چاہئے۔وہاں آپ کا جانا ضروری ہے، اس کا نہیں۔"

ماما باقاعدہ بحث کے موڈ میں آ گئی تو پاپا بھی پیچھے نہ رہے۔ وہ دونوں بحث میں اُلجھ گئے۔پہلے تو وہ چپ چاپ کھانا کھاتا رہا پھر وہ ان دونوں کو بحث کرتے چھوڑ کر اُٹھ گیا۔اس نے تلخی سے سوچا کہ ماما نے اس کی خواہش کو اپنی مامتا کے بوجھ تلے دبا کر کچل دیا ہے۔وہ سمجھتا تھا کہ اس وقت جبکہ وہ بحث کر رہے ہیں اپنی رائے کا اظہار کرنا گویا اپنی بات کو بے اہمیت کردینے کے مترادف ہے۔انا کی جنگ میں لفظوں کو بے حرمت کرنا نری حماقت ہوتی ہے۔

اگلے دن وہ گھر میں تنہا تھا۔اس دن وہی اس کا بڑا سا گھر تھا۔وہی اس کا اپنا کمرہ، وہی نوکر ظفرو اور اس کی بیوی صابراں۔صرف اس کی ماما اور پاپا گھر پر نہیں تھے لیکن اسے سب کچھ بدلا ہوا لگ رہا تھا۔نہ ارد گرد کتابیں، نہ والدین کی ان دیکھی نگاہوں کا حصار، نہ کھانے پینے میں زور زبردستی، نہ وقت پر کالج جانے کی فکر۔اس کا ایسا کوئی دوست نہیں تھا کہ جس سے مل کر ڈھیروں باتیں کرے۔اس کا بہن بھائی بھی کوئی نہیں تھا۔ وہ اکلوتا تھا۔بس وہ تھا، گھر تھا اور اس کے ساتھ تنہائی تھی۔وہ ننگے پاؤں پورے گھر میں پھرتا رہا تھا۔نوکروں کے ساتھ فرش پر بیٹھ کر دال چاول کھائے، پوری آواز سے ٹیلی ویژن چلتا رہا، شام ہوتے ہی اس نے ساری بتیاں جلا کر گھر روشن کر دیا اور رات دیر تک یونہی بلا وجہ جاگتا رہا۔پھر پتہ نہیں کب اسے نیند آ گئی۔اگلی صبح جب وہ بیدار ہوا تو کمرہ دھوپ سے بھرا ہوا تھا۔اسے ایک گونہ خوشی محسوس ہوئی کہ پہلی بار ایسا ہوا کہ بیدار ہوتے وقت ذہن پر کسی قسم کا بوجھ نہیں تھا، نہ کالج جانے کے لئے دیر ہو جانے کا ڈر اور نہ ماما کا حکم کہ جا کے سیر کر کے آؤ۔ وہ کسلمندی سے کتنی دیر تک بیڈ پر پڑا رہا۔اس صبح اس نے ناشتہ بھی نہیں کیا، کہیں دوپہر کے بعد جا کر کھانا کھایا۔صابراں اس کے سامنے سے برتن سمیٹ رہی تھی کہ وہ بولا۔

"صابراں!میرے لئے ذرا تیز پتی والی چائے بنا کر لاؤ، مگر لانا جلدی۔"

اس کے یوں کہنے پر صابراں نے قدرے حیرت سے اس کی جانب دیکھا پھر ہچکچاتے ہوئے بولی۔

"مگر چھوٹے صاحب......؟"

اس اُدھورے فقرے میں وہ اس کی بات نہ ماننے کا عندیہ دے رہی تھی۔تبھی اس نے بھویں اچکاتے ہوئے سخت لہجے میں کہا؛

"یہ مگر کیا ہوتا ہے۔ میں نے جو کہا ہے، وہ سنا نہیں؟"

"وہ جی......بی بی جی...... وہ تو آپ کو تیز پتی نہیں پینے دیتیں۔انہوں نے خاص طور پر کہا تھا کہ میں......"

"اس وقت میں تمہیں کہہ رہا ہوں اور جو کہہ رہا ہوں اس پر عمل کرو۔اب جاؤ......"

اس نے بات کاٹتے ہوئے تیزی سے کہا۔اس کے لہجے میں غصہ نمایاں تھا۔ وہ چپ چاپ چلی گئی۔

"اچھی آمریت ہے۔"

وہ تلخی سے بڑبڑایا تو غصے میں لپٹی ہوئی سوچ کی رَو میں بہہ نکلی......

'یہ میری ماما مجھ پر آمریت کیوں مسلط کرتی ہیں۔اگر میں نے معمولی سی چائے میں نے اپنی مرضی اور خواہش کی بات کی ہے تو ماما کی پسند اور ناپسند سامنے آن ٹھہری ہے، گویا میری اپنی کوئی مرضی نہیں......'

ایسا سوچتے ہوئے خیالات کا لامتناہی سلسلہ چل نکلا۔ ماما اسے کیسے روکتی ٹوکتی ہے، معمولی معمولی سی خواہشوں کو انتہائی سختی سے رد کر دیتی ہیں اور کبھی بن مانگے اتنا کچھ مل جاتا رہا ہے کہ اس کی ضرورت سے بھی بڑھ جاتا...... چائے آ جانے تک ماضی کے دھندلکوں میں سے کئی یادیں اُبھریں۔وہ ان یادوں کو ٹٹولتا رہا۔اس نے ہلکا چائے کا گھونٹ لیا تو نجانے اسے وہ چائے کیوں اچھی نہ لگی حالانکہ صابراں ایسی ہی چائے بنا کر لائی تھی جیسی وہ چاہتا تھا۔شاید ٹوکنے کی کڑواہٹ چائے کے ذائقے میں شامل ہو گئی تھی۔

وہ سوچنے لگا۔ماں آخر ایسا کیوں چاہتی ہے کہ میں ہر کام اسی کی مرضی کے مطابق کروں...... اس کی ہر خواہش کو بلاچون وچراں تسلیم کرلوں۔بس اسی کی مانوں۔ کیا ماں کو احساس نہیں ہے کہ میرے اندر میری اپنی خواہشیں ہوسکتی ہیں۔ مجھے بھی اپنی مرضی کرنے کا حق ہے۔ ہم جماعت ساتھی اپنی من مانیاں کرتے ہیں۔ جب وہ اپنی من

مرضیاں بیان کرتے ہیں تو کس قدر سنسنی پھیل جاتی ہے۔ گھر سے باہر وہ بھی کئی طرح کی مستیاں کرتا تھا اور ایسا کر کے اسے ایک گوناں گوں سکون اور لذت میسر آجاتی تھی۔ مگر ایسے سکون اور لذت کے ساتھ ایک خوف بندھا رہتا تھا۔ جس سے مستی کی تمام چاشنی کا مزا کرکرا ہو جاتا تھا۔ بالکل اس شخص کی طرح جو بارش میں بھیگنے کا مزہ لے رہا ہو تو اچانک اسے اپنا کچا گھر یاد آجائے۔ اسے افسوس ہی ہوتا کہ ایسا کیوں کیا؟ بچپن سے لے کر جوانی کی حدوں تک وہ کھل کر اپنی من مانی نہیں کر پایا تھا۔ پہلے وہ مجبور تھا پھر اسے عادت ہوتی چلی گئی۔ اسے اس دن تنہائی میں موقعہ ملا تو پھر وہی روک ٹوک......؟ ماما نہیں ہے گھر میں لیکن ان کا حکم گھر میں جلاد کی طرح اس پر مسلط تھا۔

یہی وہ لمحات تھے جب اس کے ذہن میں باغیانہ سوچ نے سر اٹھایا اور پھر وہ اپنے متعلق سوچتا چلا گیا۔ تنہائی کتنی قیمتی چیز ہے، جس نے پہلی بار اسے خود سے آشنا کیا۔ وہ اپنی ذات میں اکائی ہے اور یہ ہی اکائی پوری کائنات سے جڑی ہوئی ہے۔ وہ اس مرکزیئے کی طرح ہے جو کسی دوسرے خلیئے سے الگ ہو کر اپنے نئے وجود میں ڈھل چکا ہو۔ اگر اس نے بحیثیت انسان بھرپور زندگی گزارنی ہے تو تنہا اپنے فیصلے کرنا ہوں گے۔ تنہا فیصلے کرنے کے لئے آزادی پہلی شرط ہوا کرتی ہے۔ کیونکہ آزادی ہی اسے فیصلہ کرنے کا اختیار تفویض کرتی ہے، انسان کا اپنا تجربہ اور اپنا علم وعرفان ہی اختیار کی اصل قوت ہوتا ہے۔ جب بھی انسان نے اپنے فیصلوں کا اختیار دوسروں کو دیا تب پھر نہ اس کی ذاتی تنہائی برقرار رہتی ہے اور نہ ہی اس کی ذاتی شناخت۔

وہ اپنے گھر میں تنہا تھا اور اس نے اپنے متعلق آزادی سے سوچا۔ آزادی کی خوشبو سے اس کے قلعہ ذہن کی فصیلیں زمین بوس ہو جاتی ہیں۔ خودسری کے ہتھیاروں سے لیس خیالات نے اس کی ذات کے کئی علاقے فتح کیے۔ سارا دن ایسے ہی باغیانہ سوچوں سے الجھتے ہوئے گزر گیا۔ دوپہر ڈھلنے کے بعد نجانے کہاں سے ایک بھٹکتی ہوئی سوچ نے آ کر سب کچھ اتھل پتھل کرنا چاہا۔

''ماما تمہیں پیار بھی تو کتنا کرتی ہیں؟''

اس سوچ کی نرماہٹ نے کچھ دیر اسے ساکت کئے رکھا۔ ماما کی محبتیں اس کے سامنے ایک کے بعد ایک آتی چلی گئیں۔ پھر وہ لمحہ آ گیا جب وہ کوئی فیصلہ کر لینا چاہتا تھا

کہ کیا وہ بالکل ماما کی سوچوں کے مطابق ڈھل جائے یا پھر اپنی من مرضی کرے، اپنے انداز سے جیئے اور اپنے اندر کے باغی شخص کے ساتھ مل کر خوب لطف اندوز ہو۔ پھر اس نے فیصلہ کر لیا۔

شام ڈھلنے سے ذرا قبل اس نے سوچا کہ ماں کی محبتیں اور اس کی ممتا ایک طرف اور اس کی اپنی خواہشیں اور امیدیں دوسری جانب۔ وہ ماں ہے اور اس کا مقام وہ سمجھتا تھا۔ وہ جو کہتی ہیں وہی ٹھیک ہوگا۔ لیکن جینا مجھے ہے اور میں وہی کروں گا جو میری مرضی ہے۔ ان حدوں میں نہیں جاؤں گا جہاں ماما ناراض ہو جائیں۔ وہ اپنی فطرت کے مطابق ممتا کی خوشبو میں لپٹا ہوا فرض نبھاتی چلی جائیں۔ میں انہیں کوئی بھی دکھ دیئے بغیر اپنی راہ پر چلوں گا۔

اس نے یہ سب سوچا اور پھر ساری سوچیں جھٹک دیں۔ وہ ایک دم سے خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا۔ بالکل اس کبوتر کی طرح جس کے پاؤں سے بندھا ہوا وزن کھول دیا گیا ہو اور وہ پوری آزادی سے فضاؤں میں اڑانیں بھرنے لگے۔ اس شام وہ اٹھا، الماری سے اپنی پسند کے کپڑے نکالے اور باتھ روم میں جا گھسا۔ دیر تک نہانے کے بعد اس نے خود تیز پتی کی چائے بنا کر پی لی۔ اس وقت سورج اپنی صف لپیٹ چکا تھا جب وہ لان کے اس گوشے میں آ بیٹھا، جہاں کھلی ہوا اُسے بہت اچھی لگی۔ وہ کتنی دیر تک وہاں بیٹھا رہا۔ بارش کے بعد سارے منظر دھل چکے تھے اور وہ انہی منظروں میں حسن تلاش کرتا رہا۔ وہ بے خود سا ہو گیا تھا۔ کافی دیر بعد صابراں نے آ کر کھانے کا پوچھا تو وہ بولا۔

''نہیں، میرا دل نہیں چاہ رہا..... تم لوگ کھاؤ، پیئو اور سو جاؤ۔ میرا جب دل چاہا میں سو جاؤں گا۔ میری فکر نہ کرو..... جاؤ۔''

اس نے کچھ ایسے سرد لہجے میں کہا تھا کہ وہ الٹے قدموں واپس چلی گئی۔ پھر وہ یونہی خالی الذہن بیٹھا خود کو سناٹے کے ساتھ ہم آہنگ کرتا رہا۔ جس طرح مختلف رنگ مل کر ایک نیا رنگ بن جاتے ہیں اور مختلف آوازیں مل کر ایک نئی طرح کی آواز کو جنم دیتی ہیں، بالکل ایسے ہی چند خاموشیاں مل جل کر ایک نئی طرح کی خاموشی کو وجود بخشتی ہیں اور خاموشی وہ نعمت ہے جو کائنات کے راز آشکار کرتی ہے۔

وہ یونہی کسی مندر میں سجے ہوئے بُت کی طرح ساکت بیٹھا تھا۔ ماحول پر سناٹے کا طلسم دھند کی مانند چھایا ہوا تھا۔ خوشبو، رنگ اور من کی خوبصورتیوں نے اسے سحر زدہ کر کے رکھ دیا تھا۔ اچانک فون کی گھنٹی نے پورے ماحول کا جادو ختم کر کے رکھ دیا۔ یوں جیسے اچانک بادلوں کی اوٹ سے سورج نکل آیا ہو اور تیز دھوپ سے زمین کا ذرہ ذرہ چمک اُٹھے۔ وہ چونکا۔ گھر کے اندر ڈرائنگ روم میں فون کی گھنٹی مسلسل بجتی چلی جا رہی تھی۔

"اس وقت کس کا فون ہوسکتا ہے؟"

شدید اکتاہٹ سے اس نے سوچا۔ زندگی میں پہلی بار اسے فون بجنے کی آواز اچھی نہیں لگی تھی۔ نجانے کون ہوگا؟ اور اس بجتی ہوئی گھنٹی میں کوئی خوشی کا مژدہ ہے یا غمی کی کوئی خبر؟ فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ گھر کے اندر کوئی بھی نہیں ہے جو فون سن کر لیتا...... ظفر اور صابراں نوکروں کے کوارٹر میں چلے گئے تھے۔ اسے خود ہی اٹھنا تھا۔ سو وہ اٹھا اور لمبے لمبے قدم اُٹھاتا ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔

"ہیلو......!"

اس نے بے دلی سے کہا تو دوسری طرف سے ماما نے بے تابانہ انداز میں پوچھا۔

"محمود بیٹے کہاں تھے تم، خیریت تو ہے ناں، اتنی دیر بعد فون اٹھایا؟"

ماما نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے جن میں ماتا کی پوری شدتیں تھیں۔

"اُو ماما......! یہ آپ ہیں؟" اس نے سکون سے کہا اور پھر گہری سانس لے کر بولا، "میں لان میں تھا یہاں تک آتے ہوئے تھوڑا وقت تو لگے گا نا۔"

"اللہ کا شکر ہے" ماما نے مطمئن انداز میں کہا پھر فوراً بولی "یہ لو اپنی نانی اماں سے بات کرو۔" پھر چند لمحوں بعد فون پر شفقت اور پیار میں بھیگی ہوئی آواز اُبھری۔

"محمود پتر۔ کیا حال ہے تیرا۔"

"ٹھیک ہوں نانی اماں! بلکہ ایک دم ٹھیک...... آپ سنائیں کیسی ہیں آپ۔"

اس نے دبے دبے جوش سے مغلوب آواز میں خوشی سے کہا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں پتر...... تم ایسا کرو فوراً تیار ہو کر یہاں آجاؤ۔ کوشش کرنا صبح بارات نکلنے سے پہلے ہی یہاں پہنچ جاؤ۔"

"نانی اماں! یوں اچانک...... کیا ہوا؟"

اس نے حیرت سے پوچھا۔

"تمہاری ماما جو تمہیں لے کر نہیں آئی، میرا بڑا دل کرتا ہے کہ میں تمہیں دیکھوں۔ زندگی کا کیا بھروسہ بس تم آجاؤ۔ ٹھیک ہے نا۔"

"جی ٹھیک ہے۔ جیسے آپ کا حکم، میں آرہا ہوں۔"

اس نے بے خیالی کے سے انداز میں کہہ دیا۔ تبھی رسیور میں سے اس کی ماما کی آواز گونجی۔ وہ اسے ہدایات دے رہی تھی کہ کون سے کپڑے لائے۔ یہاں تک کیسے پہنچے۔ بالکل یوں جسے وہ بچہ ہو اور پہلی بار کہیں سفر پر نکلا ہو۔ وہ بڑے تحمل سے سب کچھ سنتا رہا۔ یہاں تک کہ ماما نے پھر سے سب کچھ دہرا یا دیا۔ اس نے دوبارہ تحمل سے سنا اور جب انہوں نے فون بند کیا تو اس نے بھی رسیور رکھ دیا۔ چند لمحوں بعد وہ صوفے پر بیٹھا یہ فیصلہ کرنے لگ گیا کہ جائے یا نہ جائے۔ اسے تنہائی بہت اچھی لگ رہی تھی۔ وہ پہلی بار خود سے ملا تھا۔ اپنے آپ سے باتیں کی تھیں۔ معمول کی زندگی سے ہٹ کر ہم کلامی سے اس پر نئے نئے انکشافات ہوئے تھے۔ وہ خود کو پُراعتماد محسوس کر رہا تھا۔ یہ نیا پن اسے بہت انوکھا اور پُرکشش لگا تھا۔ وہ صوفے پر پھیل کر بیٹھ گیا اور پوری توجہ سے سوچا کہ جائے یا نہ جائے؟ تبھی اس کے تصور میں ماما کا چہرہ اُبھرا، اسے وہ پریشان سی، اس کی راہ تکتی ہوئی دکھائی دی۔ ماما کی اوٹ میں نانی کا شفیق چہرہ۔ پھر ایک کے بعد ایک ایک کر کے نجانے کتنے چہرے اس کی نگاہوں کے سامنے سے گزر گئے۔ وہ ایک ہی پل میں وقت کی طنابیں توڑ کر ماضی کے ان دنوں میں جا پہنچا، جب وہ اپنی ماما کے ساتھ ننھیال جایا کرتا تھا۔ بچپن کی ڈھیروں یادیں اور ان دنوں کے معصوم دوست یاد آگئے۔ جو اس کی یادوں میں معصومیت بھرے چہروں کے ساتھ محفوظ تھے۔ اب پتہ نہیں وہ کیسے ہوں گے۔ یہی سوچتے ہوئے اس نے اپنے وجود پر نگاہ ڈالی پھر اس مناسبت سے نجانے کیا کچھ سوچ ڈالا۔

چہرہ......! جو کہ انسان کا تعارف ہوتا ہے، اپنے اندر نجانے کس قدر اور کتنی

گہرائیاں بھی رکھتا ہے، جہاں وہ اس کی شناخت کا باعث بنتا ہے کہ وہ کس قوم اور قبیلے سے تعلق رکھتا ہے، وہاں وہ تہہ در تہہ رازوں کا امین ہوتا ہے۔فطرت کا یہ کتنا خوبصورت راز ہے کہ سبھی انسانوں کو وہی آنکھیں، وہی ناک اور ہونٹ عطا ہوئے ہیں لیکن سب ایک دوسرے سے مختلف اور منفرد ہیں۔چہرے کے نقوش بچپن میں واضح ہوتے ہیں، پھر بڑھتی عمر کے ساتھ انہی نقوش پر کئی موسم گزرتے ہیں اور کئی رنگ آتے ہیں لیکن اپنی بنیاد میں وہ منفرد ہوتا ہے اور یہی اس کی شناخت بنتا ہے۔

چہرہ......! جو اپنے طور پر ایک پوری دنیا رکھتا ہے اور اس دنیا کو کھوجنے والے جب مسافت پر نکلتے ہیں تو زمانے بھر کی رعنائیاں ان کے حصے میں آتی ہیں۔انہی رعنائیوں کے بیان میں تشبیہات، استعارے اور مثالیں رنگوں کا وہ سماں باندھتے ہیں کہ جس سے فطرت اور بھی خوبصورت دکھائی دینے لگتی ہے۔پھر اس کے ذہن میں خیالات کی رُو اس جانب مڑ گئی کہ معلوم نہیں کتنا کچھ بدل گیا ہوگا؟ وہ سارے بچپن کے دوست اب کیسے ہو گئے ہوں گے؟ کیا وہ ان کے چہروں سے انہیں پہچان پائے گا؟ وہ گھر، وہ راستے، وہ لوگ، وہ شہر ویسے کے ویسے ہی ہوں گے یا کچھ تبدیل ہو گیا ہوگا؟ اگر تبدیلی آئی بھی ہوگی تو کس حد تک؟ اُسے لگا جیسے ماضی کے ان دیاروں میں کسی نئی دنیا کی دریافت ہوسکتی ہے، بلاشبہ یہ نئی دنیا اس کے اندر کی کیفیات ہی تھیں۔شاید وہ کہیں بچپن کے سمندر سے جذبوں کے نئے جزیرے تلاش کر سکے۔اچانک ہی وہ اپنے ننھیال جانے کے لئے تیار ہو گیا۔وہ اٹھا اور باہر پورچ میں آ گیا۔اسے یوں رات گئے تنہا پورچ میں دیکھ کر پٹھان چوکیدار اس کے پاس تیزی سے چلا آیا اور بولا۔

”صیب......آپ......؟“

اس نے آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے پوچھا۔

”وہ ظفرو کو بلا لاؤ۔اسے کہو کہ ذرا جلدی آئے۔“

یہ کہہ کر وہ واپس اندر چلا گیا۔اس کا رخ اپنے کمرے کی طرف تھا۔ظفرو جلد ہی آ گیا۔یوں تیاری میں گھنٹہ بھر سے زیادہ وقت لگ گیا۔

”میں چھوڑ آؤں صاحب آپ کو......؟“

ظفرو نے اسے گھر سے نکلتے ہوئے دیکھ کر دھیرے سے پوچھا۔

”نہیں...... یہیں نزدیک چوک سے مجھے کوئی نہ کوئی سواری مل جائے گی۔تم جاؤ، آرام کرو“۔

اس نے گھمبیر لہجے میں کہا اور اپنا سوٹ کیس اٹھا کر چل پڑا۔

وہ اپنے ننھیالی شہر پہنچا تو رات کا دھندلکا چھٹ چکا تھا۔صبح کی روشنی، اس شہر کی مہک اور ہوا کا مزاج اسے بہت اچھا لگا۔وہ محض راستوں کو دیکھنے کے لئے تانگے پر سوار ہو کر اسٹیشن سے نکلا۔اگرچہ راستے وہی تھے مگر ان کے خد و خال میں تبدیلی آ گئی تھی۔جب وہ اپنی نانی اماں کے گھر پہنچا تو سورج نے اپنی کرنیں پورے شہر پر نچھاور کر دیں تھیں۔ تنگ سی گلی میں بڑے دروازے والا گھر، وہ بلا جھجک اندر داخل ہو گیا۔سامنے ہی دالان تھا اور بڑی سی چوکی پر بیٹھی ہوئی نانی اماں۔وہ چند عورتوں میں گھری شاید اسی کے انتظار میں یوں بیٹھی تھیں۔اس پر نظر پڑتے ہی نانی اماں کا چہرہ کھل اٹھا اور بے ساختہ کہا۔

”شکر ہے میرے ربا‘ میرا پتر خیریت سے پہنچ گیا۔“

لہجے کی تاثیر محمود کے من میں اتر گئی، جسے اس نے لمس کی طرح محسوس کیا۔وہ بے تابانہ انداز میں نانی اماں سے لپٹ گیا۔نانی نے پیار سے لپٹاتے ہوئے پوچھا۔

”تمہیں تو جلدی پہنچ جانا چاہیے تھا، اتنی دیر کیوں ہو گئی۔ بارات بھی چلی گئی ہے۔“

”بس نانی امی......! گاڑی لیٹ ہو گئی۔“

اس نے خوشگوار لہجے میں کہا تو وہ بولیں۔

”چل کوئی بات نہیں......! تو منہ ہاتھ دھولے، پھر ناشتہ کرکے آرام کر، باتیں بعد میں ہوتی رہیں گی، یہ کہہ کر انہوں نے وہاں بیٹھی خواتین سے فرداً فرداً تعارف کروایا۔

وہ انہیں سلام کرتا اور ان سے پیار لیتا رہا۔تبھی اس نے پوچھا۔

”نانی اماں! ماما کہاں ہیں؟“

”وہ گئی ہے بارات کے ساتھ، تمہارے پاپا بھی گئے ہیں، جا ہی نہیں رہی تھی، کہہ رہی تھی کہ تمہارا انتظار کرے گی مگر میں نے زور دے کر بھیج دیا۔“

انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"وہ ابھی تک مجھے بچہ ہی سمجھتی ہیں۔"

اس نے جیسے شکوہ کیا' لہجے میں باغیانہ سوچ کی گرمی تھی۔

"یہی بات تیرا پاپا اسے سمجھا رہا تھا" یہ کہہ کر وہ خیالوں میں کھو گئی۔ پھر چند لمحوں بعد چونکیں اور بڑے ہی جذباتی انداز میں کہا:"بس تیری محبت ہے نا پتر، جب تو باپ بنے گا تو تجھے معلوم ہوگا، خیر! چل تو جا' منہ ہاتھ دھوآ......" انہوں نے کہا اور قریب بیٹھی ایک خاتون کو جلدی سے ناشتہ بنالانے کے لیے کہا۔

ناشتے کے بعد اسے ایک کمرہ مل گیا جو اوپر کی منزل پر تھا۔شام تک اسے کسی نے بھی ڈسٹرب نہیں کیا۔وہ بڑے سکون سے سویا رہا۔ وہ اٹھا تو سہ پہر ہو چکی تھی۔ وہ کچھ دیر کھلی کھڑکی کے پاس کھڑا لمبی لمبی سانسیں لیتا رہا۔اسے لگا جیسے اپنے گھر میں اچانک ملنے والی تنہائی کی لذت اور آزادی کی سرشاری اس کے ساتھ یہاں بھی آ گئی ہے اور وہ کیفیات بھی، جن سے اس کا تعارف ہو چکا ہے۔وہ مسرور ہو گیا۔اس نے سوچا کہ پوری دنیا کو روشن کر دینے والے سورج کو وہ یہیں کھڑے کھڑے ہاتھ بڑھا کر تھام سکتا ہے۔ بلاشبہ اس کا من روشن ہو چکا تھا۔جیسے پانی میں پانی مل جائے تو الگ شناخت نہیں رہتی، ہوا میں ہوا شامل ہو جائے یا روشنی میں روشنی گھل مل جائے ، یا پھر کشش......! جس کا ایک ہی اصول ہوتا ہے کہ مدار میں آنے والی ہر شے کو اپنی جانب کھینچ لے۔وہ یہ تعین نہ کر پایا کہ کشش اس کے من کی روشنی میں ہے یا سورج میں، کون کس کو کھینچ رہا ہے۔ پھر اس نے اس تعین کو بھی ادھورا چھوڑ دیا کہ بعض باتیں ادھوری چھوڑ دی جائیں تو ادھورے پن میں لذت بڑھتی رہتی ہے، وہ تازہ دم ہونے کے لیے باتھ روم میں گھس گیا۔ وہ تازہ دم ہو کر صوفے پر آ بیٹھا اور ٹی وی آن کر دیا۔اس وقت انگریزی میں خبریں آرہی تھیں، وہ سن رہا تھا کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔اس نے بڑھ کر دروازہ کھولا تو سامنے ملازمہ کھڑی تھی۔ اسے دیکھتے ہی بولی۔

"بڑی بی بی جی یاد فرما رہی ہیں ، کہہ رہی ہیں کہ تیار ہو کر آ جائیں۔"

"ٹھیک ہے'میں آرہا ہوں۔"

اس نے کہا اور پلٹ آیا پھر تیار ہونے لگا۔اس نے کاٹن شلوار قمیض میں ہلکے آسمانی رنگ کا انتخاب کیا تھا۔ وہ سکون سے تیار ہو کر تازہ دم سا نانی اماں کے پاس جا

پہنچا۔ وہ بڑے کمرے میں تنہا بیٹھی ہوئیں تھیں۔

"جی......!"

اس نے ہنکارا بھرا۔

"بھوک تو لگی ہوگی۔میں نے تمہیں جگایا ہی نہیں تا کہ خوب جی بھر کے آرام کرلو۔"

وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔

"یہ تو آپ نے بہت ہی اچھا کیا اور یقین جانیں اس وقت مجھے بھوک زوروں کی لگ رہی ہے۔"

یہ کہتے ہوئے وہ ہنس دیا۔

"خیر! کھانا تو ہم تیرے ماموں عبدالشکور کے ہاں جا کر ہی کھائیں گے۔ فاخرہ کی مہندی جو ہے آج، فی الحال تم پھل کھاؤ۔"

انہوں نے کہا تو ملازمہ ٹرے میں پھل لے کر کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے قریب پڑی میز پر ٹرے رکھ دی۔اس نے سیب اٹھایا اور کھانے لگا۔ اس دوران نانی پوتا باتیں بھی کرتے رہے۔ تب اچانک اس نے پوچھا!

"نانی امی......!خالہ زہرہ آئیں ہیں کیا؟"

"آئی ہے،بارات کے ساتھ گئی ہے۔ اس کے ساتھ سحرش بھی ہے۔"

"ہاں سحرش نے مجھے فون پر بتایا تھا کہ وہ لوگ بھی آرہے ہیں۔کب آئے تھے وہ؟"

"تمہارے ماما ،پاپا کے آنے سے ایک دن پہلے۔"نانی اماں یہ کہتے ہوئے اپنے خیالوں میں کھو گئی پھر شدت جذبات سے کہا "مجھے تو بہت اچھا لگ رہا ہے،سب آگئے ہیں، میں نے بھی جیتے جی سب کے چہرے دیکھ لئے۔ اب نجانے زندگی ساتھ دے کہ نہ دے؟"

"ایسی باتیں نہیں کرتے نانی اماں۔"

اس نے لاڈ سے کہا اور پھل سامنے سے پرے ہٹا دیے۔نانی اماں ایسے ہی پرانی یادیں دہرانے لگیں۔اس کی ماما کی باتیں، اس کی خالہ ،ماموں اور دوسرے لوگوں

کے بارے میں۔کافی وقت گذر گیا تو وہ چونکتے ہوئے بولیں۔

"چل اب تیرے ماموں عبدالشکور کے ہاں چلتے ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ لاٹھی کا سہارا لینے کی بجائے محمود کو پکڑ کر اٹھ گئیں۔وہ دونوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ماموں عبدالشکور کے گھر جا پہنچے۔وہاں خوب گہما گہمی تھی۔ اشعر کی بارات واپس آچکی تھی۔ کافی زیادہ مہمان دوسرے شہر میں دلہن ہی کے گھر رہ گئے تھے تاکہ اگلی صبح بارات کے ساتھ آسکیں۔اس کی ماما اور پاپا کے ساتھ سحرش بھی ادھر ہی رہ گئی تھی۔ جب کہ خالہ زہرہ واپس آکر آرام کرنے چلی گئیں تھیں۔تھکے ماندے مہمان ماموں فیروز کے گھر میں تھے اور جو ذرا زندہ دل تھے وہ فاخرہ کی مہندی میں آن موجود تھے۔ وہ جیسے ہی نانی اماں کے ساتھ شادی والے گھر میں داخل ہوا سبھی کی نظر اس پر پڑیں۔ بڑے سے صحن میں دری بچھائے بہت ساری لڑکیاں ڈھولک بجارہی تھیں۔بھرا بھرا گھر،خوبصورت اور پرکشش ملبوسات میں جوان لڑکے اور لڑکیاں،زرق برق کپڑوں اور زیورات سے لدی پھندی خواتین ،رنگ اور خوبصورتی چاروں جانب بکھری ہوئی تھی۔ ایک طرف کونے میں بیٹھے ہوئے خاندان کے بڑے افراد،کھیلتے ہوئے بچے اور روشنی میں چمکتا ہوا سارا ماحول اسے بہت اچھا لگا۔وہ ابھی یہ سب دیکھ ہی رہا تھا کہ ایک لمبا تڑنگا اور وجیہہ لڑکا اس کی طرف بڑھا، جس کے چہرے پر نرم سی بھوری مونچھیں اور داڑھی تھی جو اسے خاصا بارعب بنارہی تھی۔ اس کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ اچھی لگ رہی تھی۔

اس نے آتے ہی محمود سے مصافحہ کیا اور بڑی گرم جوشی سے بولا؛

"آیئے محمود بھائی!خوش آمدید۔" یہ کہہ کر اس کے چہرے پر شرارت رینگ گئی پھر وہ بولا"یقیناً آپ مجھے نہیں پہچان پائے ہوں گے۔"اس نے کہا تو محمود ایک لمحہ کو پریشان ہوگیا' پھر اعتراف کرتے ہوئے بولا؛

"سوری!میں واقعی آپ کو نہیں پہچان پایا۔"

"ذرا ماضی میں جائیں......بچپن میں آپ کو......" وہ کہنا چاہ رہا تھا کہ محمود کو گمان سا ہوا ،کئی سارے بچوں میں سے ایک چہرہ اس کے تصور میں ابھرا ،پھر اس کے خال وخد ابھر آئے تو وہ تیزی سے،شدت کے ساتھ بولا؛

"ذیشان! میرا کزن ،ماموں جی عبدالغفور کا بیٹا ،صحیح کہا نا میں نے؟"

اس کے لہجے میں دل آویزی تھی۔

"بالکل ٹھیک پہچانا۔"وہ بولا اور اسے گلے لگالیا۔اگرچہ بچپن کے نقوش وقت کے ساتھ مدہم پڑ گئے تھے اور وہاں ایک بالکل نیا چہرہ تھا تاہم یہ تو حقیقت تھی ناکہ بچپن کے مدہم نقوش ہی کا تسلسل یہ چہرہ تھا۔اسے وہ شخص بہت اچھا لگا۔"مجھے معلوم تو ہوگیا تھا کہ آپ آگئے ہیں۔میں دادی اماں کے گھر گیا بھی تھا مگر پھر آپ کے آرام کے خیال سے ڈسٹرب نہیں کیا ،آئیں،میں آپ کو سب سے ملواتا ہوں۔"

نانی اماں ایک طرف خواتین میں جا بیٹھیں اور وہ اس کے ساتھ چل پڑا ،پھر کس کس سے تعارف ہوا ،کیا کیا باتیں ہوتی رہیں،اسے کچھ یاد نہیں رہا ،سب کچھ گڈ مڈ ہوگیا۔ کتنے سارے لوگ اس سے ملے تھے ،ہر ایک چہرہ اس کے لیے نیا پن لے کر آیا تھا۔مسکراہٹوں کے تبادلے ،قہقہے ،شوخ فقرے،رسمی باتیں ،بولتی آنکھیں،نرم، دل آویز، پرکشش، پھیکے'سخت اور خوبصورت چہرے۔کسی کی آنکھیں مسحور کن تھیں تو کسی کے ہونٹ توجہ کھینچتے تھے ،کسی کے جھمکے کی اوٹ سے گردن پیاری دکھائی دیتی تھی تو کسی کی لٹ اس کے گالوں کی نشاندہی کر رہی تھی۔کسی کا سراپا پرکشش تھا اور کسی کی باتیں دل موہ لینے والی تھیں۔کسی کے لہجے میں گرم موسموں کی حدت تھی تو کسی کا لمس برفیلی ہواؤں کا احساس دے رہا تھا۔وہ کھانا کھا چکا تو پھر وقت گذرنے کا پتہ ہی نہ چلا۔اسے لگا جیسے وقت ٹھہر گیا ہو مگر گھڑی کی سوئیاں آگے سرکتی چلی گئی ہوں۔مہندی کی رسمیں ہوگئی تو اس کے لیے یہ ایک کھیل بن گیا ،وہ بچپن کی یادوں میں سے ایک چہرہ اپنے تصور میں لاتا اور پھر ان بے شمار چہروں میں تلاش کرنے لگتا۔وہ محسوسات کی اس دنیا کی لذت میں ڈوب کر رہ گیا ، جہاں اسے کسی کا سراغ ملتا اور کسی کا نہیں۔ایسے میں نانی اماں کا بلاوا آگیا۔ ذیشان ابھی بھی اس کے ساتھ تھا۔وہ فوراً ان کے پاس پہنچا؛

"کیسا لگا یہ ہنگامہ میرے پتر کو؟"

انہوں نے انتہائی لاڈ سے پوچھا۔

"نانی امی ،بہت اچھا۔سبھی بہت اچھے ہیں۔"

اس نے خوشدلی سے کہا

"دیکھ پتر!میں تو گئی ہوں تھک۔ میں اب آرام کروں گی۔تم اگر چاہو تو ادھر

رہو اور جب سونا ہو تو آ جانا۔"

یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ گئیں۔

"میں بھی چلوں گا۔"

وہ فوراً ہی تیار ہوگیا، اس نے نانی اماں کا ہاتھ پکڑا اور چل دیا، واپس ان کے گھر آتے ہی اسے پراسرار خاموشی بہت اچھی لگی۔ دھیمی روشنی اور سناٹے نے اس کے اندر کے اس شخص کو بیدار کردیا جو اس سے باتیں کیا کرتا تھا۔ اس کا تجربہ اسے انہی تین دنوں میں ہوا تھا۔ وہ خوشی سے بھر گیا، بڑے کمرے میں آ کر نانی اماں تو اپنے کمرے میں چلی گئیں اور وہ اوپر جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ کچھ مہمان ان کے ہاں آرام کررہے تھے لیکن سب نیچے ہی تھے، اوپر کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ کمرے میں پہنچا تو گھر کا پرانا ملازم دروازے چیک کرنے کے بعد اس کے پاس آیا، بڑے مودب لہجے میں بولا؛

"صاحب! میں نے دروازے سارے لاک کردیئے ہیں۔ مجھے نیچے جا کر سونا ہے۔ آپ جب سونے لگیں تو احتیاط سے یہ دروازہ لگالیں۔"

اس نے سامنے کے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے تم جاسکتے ہو۔"

محمود نے لاپرواہی سے کہا تو وہ ملازم چلا گیا۔ کچھ دیر وہ یونہی کسی بھی سوچ کے بغیر ساکت سا بیٹھا رہا۔ پھر اٹھا اور باہر صحن میں نکل آیا۔ برآمدے میں بلب روشن تھا جس کی وجہ سے صحن میں بھی ہلکی روشنی تھی۔ وہ صحن کے عین درمیان میں آ کر کھڑا ہوگیا، کھلی ہوا میں گہرے گہرے سانس لینا اسے مزہ دے رہا تھا، ڈھلتی رات کی خاموشی ہر جانب پھیل چکی تھی۔ نانی اماں کا یہ گھر گنجان آباد علاقے میں پرانی طرز کا تھا، بارشوں کی وجہ سے باہر کی دیواریں کالی ہوچکی تھیں۔ اردگرد کے مکان اور ان کی چھتیں ویسا ہی کائی زدہ منظر دکھا رہی تھیں۔ وہ کافی دیر تک یونہی ادھر ادھر پھرتا ہوا پرانے مکانوں کی ساخت اور تبدیلیوں پر غور کرتا رہا۔ بچپن میں جب وہ آیا کرتا تھا تو اتنا گنجان پن نہیں تھا، وہ یہی سوچتا ہوا دیوار کے پاس رکھی ایک لوہے کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کا رخ برآمدے کی جانب تھا اور بلب کی روشنی اس کے چہرے سے کافی دور تھی۔ اسے کچھ دیر قبل ماموں عبدالشکور کے گھر گذرا ہوا وقت یاد آنے لگا۔ اسے ایک ایک کر کے سارے چہرے

یاد آنے لگے۔ کئی چہروں پر تو ماضی کے نوشتے رقم تھے اور کئی چہرے اجنبی تحریروں جیسے تھے، وہ ماضی سے حال کے خلا میں جاگرا جہاں پر یادوں کی بازگشت اسی خلا میں پگھلنے لگی، اس کے ذہنی در کھلنے لگے۔ پھر اچانک ہی ماضی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور حال نے بڑی نرمی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اک دم سے نئی دنیا ابھر آئی اور وہ خود بھی اس دنیا کا حصہ بن گیا۔

کتنی خوبصورتی بکھری ہوئی تھی۔ کیسے پیارے لوگ، پرکشش مسکراہٹیں، ان کہی داستانیں، کھلتے ہوئے چہرے، کھٹی میٹھی باتیں اور رنگوں سے مزین لمحے، اسے لگا جیسے اس کھنکتے ہوئے وقت سے ڈھیروں تصویریں وہ اپنے ذہن میں محفوظ کرچکا ہے۔ اسے اس انکشاف پر بہت خوشی ہوئی۔ وہ بڑی آزادی سے ان تصویروں کو نکال کر دیکھنے لگا۔ ایک کے بعد ایک اور تصویر، وہ شمار ہی نہ کرسکا کہ اس کے پاس کتنی تصویریں جمع ہیں۔ پھر اسے محسوس ہوا کہ یہ ساری تصویریں ہوا سے پھڑ پھڑانے لگی ہیں جیسے ہلکورے لیتے ہوئے پانی پر عکس ہو۔ انہی لمحوں میں اسے احساس ہوا کہ بھی تصویریں ساکت نہیں ہیں؛ ان میں ایسی بھی ہیں جو اس سے ہم کلام بھی ہورہی ہیں۔ شوخ جملے اپنی پوری تازگی کے ساتھ مہکنے لگے اور وہ اس خوشبو سے سرشار ہونے لگا۔ اسے یہ جان کر بڑی لذت محسوس ہورہی تھی کہ یہ سب مسحور کن کیفیات اپنے من سے ملنے کے بعد ہی میسر آئی ہیں۔ اس نے خود کو کسی انجانی گرفت میں نہیں دیا ان تصویروں کو لے کر کائنات میں پھیل جانے کی شدید خواہش اس کے اندر مچلنے لگی تھی مگر اسے ان بولتی ہوئی تصویروں کی دنیا میں تہہ در تہہ اتر جانے میں زیادہ دلچسپی تھی۔

اچانک اسے کھٹکا محسوس ہوا۔ فطری طور پر اس نے کھٹکے کی سمت دیکھا، مگر وہاں کوئی نہیں تھا لیکن اگلے ہی لمحے اس کی ساری توجہ اس طرف لگ گئی۔ ایک مرمریں ہاتھ دھیرے سے وہ دروازہ کھول رہا تھا۔ اس ہاتھ کی تراشیدہ انگلیوں میں سے ایک میں سبز نگینے والی طلائی انگوٹھی اور ناخنوں پر چاندی جیسی نیل پالش لگی ہوئی تھی۔ پھر کلائی دکھائی دی، جس میں سرخ نگوں والا ہلکا طلائی بریسلیٹ تھا۔ اس کا تمام تر تجسس مرمریں ہاتھ اور گوری کلائی کے پیچھے اس وجود کے لیے شدت اختیار کر رہا تھا جو دروازے کے پیچھے تھا مگر سامنے نہیں آرہا تھا، پگھلتی ہوئی برف کے قطروں کی طرح لمحے اپنا وجود کھو رہے

تھے اور اس کا تجسس بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلوں کی مانند بڑھ رہا تھا، اس سے پہلے کہ وہ آواز دیتا وہ وجود آہستہ آہستہ اس کے سامنے آتا چلا گیا۔

سیندور ملی گوری رنگت پر سفید لباس ،جس پر ہلکے گلابی رنگ کے چھوٹے چھوٹے پھول تھے، بھرا ابھرا سراپا لباس میں سے چھلک رہا تھا۔جیسے اس سراپے کی خوبصورتی ہی لباس کو وقار بخش رہی ہو۔ ہاف بازو قمیص سے مرمریں گداز بازو اور کھلے گلے سے نکلتی ہوئی شفاف گردن میں سونے کی ہلکی سی زنجیر تھی، گھنے سیاہ بال کمر سے بھی نیچے تک جارہے تھے۔ درمیان میں نکلی ہوئی مانگ اور دائیں جانب سفید پھول اٹکا ہوا تھا۔گول چہرے پر سب سے پہلے اس کی آنکھیں توجہ کھینچ رہی تھی ،بڑی بڑی ،سیاہ اور نشیلی آنکھوں میں سے ٹپکتا ہوا خمار اور گھنیری پلکوں نے ان آنکھوں کی چمک کو مزید واضح کردیا تھا۔کھڑی ناک میں پتلی تار جیسی تھلی اور گلاب کی پنکھڑیوں جیسے نازک ہونٹ 'وہ چہرہ کسی بھی خوبصورت چہرے کی تشریح تھا لیکن ان خدوخال میں اک انہونی کشش تھی جس نے اس کی ساری توجہ کھینچ لی تھی ،شبنمی چہرے پر سے ہویدا تقدس ،کسی فرشتے کی دعا لگ رہا تھا۔اس کے سامنے روشن بلب مدقوق لگ رہا تھااور وہ رُخ روشن اس کے اندر چاندنی پھیلاتا چلا گیا۔ انہی لمحوں میں اس پر انکشاف ہوا کہ چاندنی راتوں میں سمندروں کے اندر طوفان کیوں اٹھتے ہیں۔وہ طوفان ہوتا ہے یا چاند کو چھولینے کا پاگل پن؟ اس کی ذرا سی توجہ اس شبنمی چہرے سے ہٹی تھی اور یہی لمحہ اسے چھن جانے کا دکھ دے گیا۔وہ وہاں نہیں تھی۔اگرچہ وہ چہرہ اس کے شعور کی پنہائیوں میں جذب ہوچکا تھا مگر وہ اسے مزید دیکھنا چاہتا تھا۔اس کا جی نہیں بھرا تھا۔وہ چونک گیا ،اسے لگا جیسے وہ چند لمحے پہلے یہاں تھا ہی نہیں۔اسے اپنے وجود تک کا احساس نہیں رہا تھا۔اسے یہ یاد ہی نہیں رہا تھا کہ وہ کہاں پر تھا اور اس کے ارد گرد بولتی ہوئی تصویروں کا جمگھٹا تھا۔وہ سجی سنوری طلسماتی دنیا بھی وہاں نہیں تھی۔ یوں جیسے کوئی ہوا کا بگولا سب کچھ اڑا کے لے گیا ہو۔ وہاں پر وہی پرانی چھت' کائی زدہ دیواریں اور مدقوق بلب کی روشنی تھی۔وہ اپنے اندر کی تبدیلی پر حیران رہ گیا کہ ایک چہرہ اس کے اندر کے جذبات اور کیفیات میں مدوجزر پیدا کرگیا۔ ایسا کیونکر ہوگیا؟ اسی راز کھولتے ہوئے لمحوں میں وہ اپنی ذات کے سفر پر نکلنا چاہتا تھا مگر وہ اس تبدیلی کی وجہ کے بارے میں بھی جاننا چاہتا تھا۔وہ اس چہرے کے

بارے میں معلوم کرنا چاہتا تھا۔

وہ کون تھی؟

کہاں سے آئی تھی؟

اور اب کہاں چلی گئی ہے؟

وہ دیوانہ وار اٹھا اور دروازے کی جانب بڑھا۔مگر یہ کیا؟وہ دروازہ تو بند تھا جو تھوڑی دیر پہلے ملازم لگا کر گیا تھا۔اس نے دھکیل کر وہ دروازہ کھولنا چاہا لیکن وہ نہیں کھلا۔ذراسی کوشش پر اسے یقین ہوگیا کہ دروازہ تو لاک ہے۔

''تو پھر وہ کیسے اندر آگئی؟''

وہ بڑبڑایا'اس کے لہجے میں حیرت اور خوف کی آمیزش تھی۔چند لمحوں ہی میں اسے باور ہوگیا کہ کوئی بھی اس دروازے سے اندر نہیں آسکتا؟ اس یقین کے ساتھ ہی خوف کی لہریں اس کے بدن میں اتر گئیں اور اس کے رواں رواں نے خوف کا اظہار کر ڈالا۔

تو کیا وہ کوئی روح تھی......؟

یا......!

اس سے آگے وہ کچھ بھی نہ سوچ سکا۔وہ نہیں چاہتا تھا کہ جو خیال اسے آیا ہے اس کی تصدیق ہوجائے وہ تو اس وجود کو دیکھنا چاہتا تھا۔اس نے ساری سوچیں ایک طرف رکھیں اور پورے جوش سے انتہائی سرعت کے ساتھ اسے تلاش کرنے لگا۔وہ دیوانہ وار سبھی کمروں میں پھرا،دوبارہ برآمدے میں آیا اور یہاں تک کہ چھت پر بھی چلا گیا۔ وہ تو پانی پر عکس کی طرح غائب ہوچکی تھی، نہ وہ ملی اور نہ ہی اس کا کوئی نشان ملا۔ وہ مایوس ہوکر دوبارہ صحن میں موجود اسی کرسی پر آن بیٹھا۔ کائی زدہ کالی دیواروں کے درمیان، خوف، مایوسی، گھبراہٹ اور کھودینے کے احساس کی اتھل پتھل میں اس پر کھلا کہ جیسے تمام سوچیں جامد ہوگئی ہیں۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ بڑے پیار کے ساتھ اس چہرے کو، اس سراپے کو، اس کے تقدس کو سوچے۔خدوخال کی راہوں سے ہوتا ہوا حسن کی سیاحت کے لئے سوچ نگر وادی میں اتر جائے۔ وارفتگی کے وہ لمحات اسے مایوسی کے اظہار سے گریزاں کر رہے تھے لیکن حقیقت کی شدت اسے مایوسی کے اندھیروں میں دھکیل رہی

تھی۔ وہ سمندر کے مدوجزر میں پھنسی کشتی کی مانند ہوگیا۔وہ سکون سے اس چہرے کو سوچنا چاہتا تھا لیکن تجسس کا طوفان اسے بھٹکا رہا تھا ،وہ بڑی دیر تک اسی بھنور میں پھنسا رہا۔ تبھی اچانک اس نے ہمت کی اور سب کچھ ذہن سے جھٹک دیا۔ پھر وہاں نہ طوفان رہا، نہ مدوجزر، نہ بھنور، نہ کشتی......وہاں سکون چھا گیا ،سناٹا 'وہی بولتا ہوا سناٹا۔ اسی ملکوتی سکوت میں اس کے ذہن کے پردہ پر وہ چہرہ روشن ہوگیا۔یوں جیسے مشرق سے سورج طلوع ہوجائے۔اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ اور اس کی روشن کرنوں سے پورا ماحول چمک اٹھے۔ہر شے واضح ہوجائے ،اپنے پورے خدوخال اور رنگوں کے ساتھ۔وہ اس چہرے کو چھو نہیں سکتا تھا لیکن اسے یوں لگا جیسے وہ اس کی دسترس میں ہے۔اک ذرا سی اجنبیت بھی تو اس نے محسوس نہیں کی تھی۔

وہ ایک طویل لمحہ تھا یا بے شمار لمحوں کا مجموعہ؟ جس میں اس نے اپنی جھلک دکھائی تھی۔ اب وہ سامنے نہیں تھی لیکن اس کے ہونے کا احساس خوشبو کی طرح مہک رہا تھا۔ اس نے واضح طور پر خود میں تبدیلی محسوس کی۔اک سنسناہٹ تھی جو خون کے ساتھ اس کے رگ و ریشے میں سرائیت کرگئی تھی۔ ایسے میں اک سوال نے سر اٹھایا جو سوالوں کے لامتناہی سلسلے کی بنیاد بن گیا۔

وہ کون تھی؟

یوں اچانک غائب کیوں ہوگئی ہے؟

وہ آئی کیوں تھی؟

کیا وہ حقیقت تھی یا واہمہ......!

"نہیں یہ واہمہ نہیں ہوسکتا ،اس کا وجود حقیقت ہے۔"

دور اندر سے کہیں مزاحمت بھری آواز ابھری جس کی بازگشت وہ دیر تک سنتا رہا۔ یوں جیسے کسی وادی میں کوئی پکارے اور پھر اپنی پکار کی آواز دیر تک سنتا رہے۔

وہ دوبارہ اٹھا اور بند دروازے کو پھر سے کھولنے لگا۔وہ مقفل تھا نہ کھلا تو تمام حجت کے لیے اندر کمروں میں اس نادیدہ لڑکی کو تلاش کرنے لگا۔ وہ اسے پھر بھی نہ ملی۔ وہ عجیب قسم کی متضاد کیفیات میں مبتلا ہوگیا۔کیف آور سرور اور مایوسی کی جھنجھلاہٹ،تقدس بھری لذت اور کھودینے کا دکھ۔وہ سارے کمرے گھوم چکا تو پھر باہر آگیا۔ بے چینیاں

اس کے بدن میں اضطراب پیدا کرچکی تھیں۔برآمدے سے باہر آکر آہستہ قدموں سے چلتا ہوا چھت والے صحن کے انتہائی سرے پر آگیا ، جہاں سے نیچے کا صحن دکھائی دے رہا تھا۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا اور نہ کسی کے ہونے کے آثار تھے۔ایک سناٹا تھا۔صحن کو روشن کرتی ہوئی ٹیوب لائٹ کی ہانپتی ہوئی روشنی اور تنہا کھڑا انار کا پودا۔اس منظر میں اکتاہٹ تھی۔ وہ پلٹ کر پھر سے کرسی پر آن بیٹھا۔نیند اس سے روٹھ چکی تھی۔ وہ اس خوبصورت سراپے والے شبنمی چہرے کے بارے میں سوچنا چاہتا تھا ،جو اس کے ذہن میں سورج کی طرح روشن تھا۔مگر ذہن کی جھیل پر انتشار کا پتھر آن پڑا تھا۔وہ عکس واضح ہی نہیں ہو پا رہا تھا۔ وہ تھک گیا۔اس کا دماغ دکھنے لگا کہ مؤذن نے اذان دے دی۔ اس نے سکون سے اذان سنی اور اٹھ گیا۔اس نے وضو کیا اور اللہ کے حضور آن کھڑا ہوا۔جس سے وہ پرسکون ہوگیا۔دعا کے بعد وہ بستر پر جا لیٹا تاکہ سوجائے۔نیند بھی اس پر مہربان ہوگئی۔ وہ آرام کرنے لگا ،بالکل اس سپاہی کی طرح جو سارا دن میدان کارزار میں جنگ لڑتا رہے اور پھر اگلے دن بہتر انداز میں لڑنے کے لئے آرام کرنے لیٹ جاتا۔

صبح اس کی آنکھ دستک دینے کی آواز سے کھلی۔ اس نے سامنے لگی گھڑی پر نظر ڈالی۔ دس بج گئے تھے۔تبھی دوبارہ دستک کی بازگشت کے ساتھ باہر سے ذیشان کی آواز ابھری۔

"اب اٹھ جا یار-:دس بج گئے ہیں...... دروازہ کھولو۔"

وہ کسمندی سے اٹھا اور دروازہ کھول دیا۔اسے دیکھتے ہی ذیشان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔اسی مسکراہٹ میں وہ شوخی سے بولا۔

"حضرت! تم اب تک سو رہے ہو۔فاخرہ کی بارات آنے والی ہے اور تم نے ابھی تیار بھی ہونا ہے۔"

محمود کچھ نہیں بولا فقط مسکرا کر رہ گیا۔رات پہلی ملاقات کے تھوڑی دیر بعد ہی ان میں آپ اور جناب کا تکلف ختم ہوگیا تھا۔اک بے تکلفانہ تعلق ان میں در آیا تھا۔وہ چند لمحے اس کی جانب خالی خالی نظروں سے دیکھتا رہا ،پھر مسکراتے ہوئے لبوں سے وجدانی انداز میں بولا؛

"تو اس کا مطلب یہ ہوا مسٹر ذیشان ! تم ناگہانی بلا بن کر نازل ہوئے ہو؟"

"نہیں ایسی بات نہیں۔" وہ جلدی سے بولا "دراصل دادی اماں تمہارا کچھ زیادہ ہی خیال کرتی ہیں۔ وہ چاہ رہی تھیں کہ تم اچھی طرح آرام کرلو' پتہ نہیں رات ٹھیک سے تمہیں نیند آئی بھی ہے یا نہیں؟"

ذیشان نے ہنستے ہوئے کہا تو محمود کو اس پر شک گذرا کہ ضرور انہی لوگوں کی شرارت ہوسکتی ہے جو اس چہرے نے رات اسے بے چین کیا۔ چہرے کا خیال آتے ہی اس کے ذہن پر طلوع صبح کی ساری تابانیاں روشن ہوگئیں۔ تازگی اور ملاحت کے ساتھ چمکتا ہوا زندگی سے بھرپور چہرہ...... وہ ایک لمحے کو سارے ماحول سے غافل ہوگیا، جیسے سرور انگیز کیفیت کا احساس لذت بخش دے۔

"ارے میاں اٹھو، اب تیار جاؤ اور ہاں بتا دو کہ ناشتہ یہیں کمرے میں کرو گے یا نیچے آکر۔"

ذیشان نے شوخی سے کہا تو وہ اپنے آپ میں آ گیا۔ اسے لفظ تو سمجھ میں نہیں آئے لیکن مدعا سمجھ گیا۔ تبھی وہ بولا؛

"یہیں منگوالو، تیاری کے ساتھ ناشتہ بھی ہوجائے گا۔" یہ کہہ کر وہ باتھ روم میں گھس گیا۔

وہ نہا کر نکلا تو ناشتہ آچکا تھا، گرم پراٹھوں، انڈوں کے آملیٹ اور اچار کی خوشبو کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ ایک دم سے اس کی بھوک چمک اٹھی۔ ذیشان کمرے میں نہیں تھا۔ اس نے تولیہ کاندھے پر ہی رہنے دیا اور ناشتہ کرنے لگا۔ اسی دوران ذیشان ایک چھوٹی سی ٹرے میں مگ رکھے آگیا۔

"لیں حضور! گرم گرم اور بہت ہی نفیس قسم کی چائے۔ پیئو گے تو یاد کرو گے۔"

ذیشان نے کہا اور بیڈ پر ہی ٹرے رکھ کر صوفے پر بیٹھ گیا تو محمود نے ناشتہ ختم کرکے برتن ایک طرف سمیٹتے ہوئے بولا؛

"کیا کیا کچھ یاد رہے گا مجھے بھی سوچ کر پریشانی ہورہی ہے۔ یہاں کی تو ہر شے یاد رکھنے کے قابل ہے۔ لیکن خیر! تم بتاؤ صبح ہی صبح ادھر کہاں سے آن ٹپکے ہو؟"

"میرے بھائی...... ! میں ٹپکا نہیں، ٹپکایا گیا ہوں۔ اب پوچھو گے وہ کیسے تو حضور! دادی اماں یعنی کہ تمہاری نانی اماں ادھر ہمارے گھر میں جلوہ افروز ہیں۔ انہوں

نے مجھے یہ فرض سونپا ہے کہ جا کر حضور والا کو جگاؤں، اپنی نگرانی میں ناشتہ کرواؤں، تیار ہو جائیں تو شاہی سواری......"

"بڑے سعادت مند بچے ہو۔" محمود نے لبوں میں مسکراتے ہوئے کہا تو دونوں ہی ہنس دیئے۔ پھر محمود نے چائے کا مگ اٹھاتے ہوئے، سوچتے ہوئے لہجے میں کہا "رات کی نسبت آج تم خاصے خوشگوار موڈ میں ہو۔ تمہاری سج دھج بھی دیکھنے والی ہے۔ اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟"

"آہ......!" ذیشان نے مصنوعی انداز میں لمبی درد بھری سانس کھینچی اور پھر ہنسی ضبط کرتے ہوئے بولا؛ "یہ میٹھے راز ہیں پیارے۔"

"پھر بھی!"

محمود نے اصرار کیا

"بتادیں گے، بتادیں گے اتنی جلدی بھی کیا ہے، ابھی تو آپ یہ حکم صادر فرمائیں کہ حضور کون سی پوشاک زیب تن فرمائیں گے۔"

ذیشان نے شوخ لہجے میں کہتے ہوئے محمود کا اصرار نظر انداز کردیا۔

"تم ہی بتادو کیا پہنوں؟"

وہ گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا اور اپنا سوٹ کیس بیڈ پر رکھ کر کھول دیا۔

"یہ سوٹ پہن لو۔"

ذیشان نے گہرے نیلے سوٹ، ہلکے نیلے رنگ کی شرٹ اور میرون کلر کی ٹائی نکال لی۔

"چلیں یہی سہی۔"

محمود نے کہا اور تیار ہونے لگا۔ پھر تھوڑی ہی دیر بعد وہ دونوں اس میدان میں آگئے جہاں بارات کے بیٹھنے کا انتظام کیا ہوا تھا۔

انہیں وہاں پہنچے تھوڑا ہی وقت ہوا تھا کہ بارات آنے کا شور اٹھا۔ شامیانوں سے ذرا فاصلے پر بارات کے استقبال کے لئے مہمان جمع ہونے لگے۔ وہ دونوں بھی انہی لوگوں میں کھڑے تھے۔ بارات پہنچ گئی تھی۔ ان کے قریب کاریں رکنے لگیں اور باراتی

ان میں سے نکلنے لگے۔باراتیوں کا روایتی استقبال کیا جارہا تھا، دونوں طرف کے لوگ مل رہے تھے، دولہا اور اس کے عزیز وں کے گلے پھولوں کے ہاروں سے بھر گئے تھ،پتیاں نچھاور کی جارہی تھیں۔محمود بھی ذیشان کے ساتھ کھڑا اس منظر کو دیکھ رہا تھا ،وہ بارات کے ساتھ آئے اپنے پاپا کو دیکھ چکا تھا اور اب وہ لاشعوری طور پر اپنی ماما کو بھی دیکھنا چاہتا تھا۔لیکن کوئی بھی خاتون دکھائی نہیں دے رہی تھی۔اتنے میں ایک بس دھیرے دھیرے سے رینگتی ہوئی ایک طرف آکر رک گئی۔تبھی اس میں سے خواتین باہر آنے لگیں۔اس میں ماما بھی تھی۔ وہ بس سے اترتے ہی متلاشی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔ جیسے ہی ان کی نظر محمود پر پڑی وہ صدقے واری ہوجانے والے انداز میں خوش ہوگئیں اور ایک اطمینان ان کے چہرے پر پھیل گیا،ان کی آنکھوں میں سکون کے دیپ روشن ہوئے تو وہ دیگر مہمان خواتین کے ساتھ ان شامیانوں کی طرف بڑھ گئی جو خواتین کے لئے مختص تھا۔

محمود نے اضطراری انداز میں وہاں سے ہٹ جانا چاہا تا کہ اپنی ماما سے مل لے مگر ذیشان نے مضبوطی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا ،جیسے وہ ابھی وہاں رک جانا چاہتا ہو۔محمود نے اس کی نگاہوں کی سمت دیکھا اور اسی لمحے وہ سانس لینا بھول گیا ،وقت جیسے تھم گیا۔ وہ حیرت کی انتہاؤں کو چھوتے ہوئے اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا جو بس سے اتری تھی۔

یقین اور بے یقینی کے درمیان خلاؤں میں گم ہوجانے والا لمحہء جاوداں۔

وہی رات والا چہرہ......وہی نین نقش...... وہی سراپا...... وہی بال...... وہی انداز اور ویسی ہی دیکھنے والی ادا۔

وہ یقین نہ کرتے ہوئے بھی ،یقین کرنے پر مجبور تھا۔

وہی لڑکی جسے اس نے رات کی تنہائیوں میں پورے حواس سے دیکھا تھا۔جس کا چہرہ اس کے لاشعور میں ہمک رہا تھا اور چہرے سے پھوٹتی تابانیوں کی جلن وہ اب تک اپنی آنکھوں میں محسوس کررہا تھا۔ وہ چہرہ تو ایسا شناسا ہوگیا تھا کہ وہ جب بھی آنکھیں بند کرکے اسے دیکھتا تو پوری جولانیوں سے اس کے سامنے ہوتا اور یہ حقیقت بالکل اس طرح تھی کہ جیسے اس کے اپنے وجود کا احساس۔

”نہیں یہ میرا واہمہ ہے......“اس نے شدت سے سوچا اور اس خیال کو بھگانے کے لئے سر جھٹکا۔

”وہ واہمہ نہیں حقیقت کی طرح تمہارے سامنے ہے۔اگر وہ واہمہ ہی تھا تو اب تک تمہارے دماغ میں کیوں ہے؟ کچھ تو خد وخال محو ہوجاتے -“

اس کے اندر سے جرح شروع ہوگئی۔

”میں دونوں میں سے ایک کو حقیقت کہہ سکتا ہوں ،دونوں کو نہیں اور یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک لڑکی جسے میں نے رات دیکھا ہے تو وہی لڑکی اب بارات کے ساتھ آگئی ہے۔ دونوں شہروں کے درمیان فاصلے وہ کیسے سمیٹ سکی ہوگی ؟ اور پھر یہ کوئی فلمی اتفاق نہیں، حقیقت کی دنیا میں ایسا ہونا ناممکن ہے۔“

اس نے جھٹ سے دلیلیں دے ڈالیں۔

”تم جو مرضی کہتے رہو، مگر یہ حقیقت ہے کہ وہ رات والا چہرہ تمہاری نگاہوں کے سامنے ہے۔کیسے ہے، کیوں ہے اور کس طرح ہے؟ اسے اب سوچنا اور سمجھنا تمہارا کام ہے۔“

اس کے اندر سے یہ بات اس قدر اعتماد سے کہی گئی کہ اس نے ہتھیار ڈال دیئے۔ وہ خود کلامی کرچکا تو وہی منظر اس کے سامنے تھا۔وہ لڑکی اس سے چند قدم کے فاصلے پر تھی۔محمود نے بھرپور نگاہوں سے اسے دیکھا ،وہ اسی کی جانب دیکھ رہی تھی۔

بس ایک لمحہ کو ان کی نگاہیں ملیں۔

وہ لڑکی ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ منہ پھیرتے ہوئے اس کے قریب سے آگے بڑھ گئی۔محمود کو لگا جیسے ایک منہ زور شوریدہ طوفانی لہر سمندر کی وسعتوں سے بچھڑی ہوئی ساحل تک آئی ہے اور پھر اسی قوت سے سمندر کی وسعتوں میں گم ہوگئی ہے۔ ایک مبہم سا فرق اسے رات والے چہرے اور اس چہرے میں دکھائی دیا۔وہ فرق کیا تھا اسے سمجھ نہ آسکی۔ذیشان اسے لے کر چل دیا تھا۔مگر اسے یہ احساس ہی نہیں تھا کہ وہ اپنے قدموں پر چل رہا ہے یا ہواؤں میں تیر رہا ہے،بے دھیان لمحوں کا یہ مجموعہ اس کی زندگی سے خارج ہوچکا تھا۔

ذہن میں مدتوں سے پڑے کسی منظر کا جب انکشاف ہوتا ہے تو اس دریافت پر خوشگوار حیرت لپٹ جاتی ہے۔اس منظر کی دلکشی ،اس کی جزئیات میں اترنے کی تڑپ اور بے چینی یہ سمجھنے ہی نہیں دیتی کہ یہ منظر کب سے بے رنگ پڑا تھا۔منظر کی دریافت ہی

دراصل اس منظر میں رنگ بھرنے کا وقت ہوتا ہے۔اس منظر کو دلکش بنانے کی تڑپ جس قدر شدید ہوگی۔ وہی شوقِ نظارہ کا نقطہ زوال بن جانے کی طرف بڑھتا ہو اقدم ہوتا ہے۔سوال یہ نہیں کہ کسی شے کا وجود میں آنا ہی فنا ہو جانا ہے بلکہ سمجھنے والی بات یہ ہے کہ یہ منظر کیسے دریافت ہوتے ہیں؟ ظاہر ہے اندھیرے میں کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ اصل شے خواہش ہے، جیسے روشنی کی خواہش کے ساتھ ہی ہمارے اندر روشنی کا تصور ابھرتا ہے یعنی روشنی ہمارے اندر ہی پڑی ہوئی ہوتی ہے، جسے خیال بیدار کردیتا ہے۔پھر ایسے ہی من سے اندھیرا ختم کرلینے کی خواہش ،اس روشنی کا منبع دل ہے جو سارے اندھیروں کو فنا کرکے رکھ دیتا ہے،تب من کی سیاحت ،حیرتوں کے جہان در جہان سامنے لاکر رکھ دیتی ہے۔

☆☆☆

بارات شہر کی حدود میں داخل ہوگئی تھی۔

تقریباً پانچ گھنٹے کے طویل سفر کے بعد اس بس کے سبھی مسافر منزل پر پہنچنے کے احساس سے ہشاش بشاش ہوگئے تھے۔بارات کے ساتھ کافی ساری کاریں اور یہ واحد بس تھی جس میں تھوڑے سے مسافر تھے۔چند مرد حضرات اور تھوڑی سی خواتین۔ آخری نشستوں سے ذرا آگے والی نشست پر دولڑکیاں براجمان تھیں اور مسلسل باتیں کرتی چلی جارہی تھیں۔

''اب پتہ نہیں کتنی دیر بعد دلہن کے گھر پہنچیں گے۔''

نادیہ نے پردہ ہٹا کر شیشے والی کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے کہا، جہاں شہر کے منظر پیچھے کی طرف گم ہوتے چلے جارہے تھے۔

''پہنچ ہی جائیں گے۔''

صوفیہ نے لاپرواہی سے کہا۔

تب نادیہ نے اپنی چمکتی ہوئی آنکھوں میں لاتعداد احساس جمع کرتے ہوئے خوشگوار انداز میں کہا؛

''صوفیہ ذرا سوچو۔! ذیشان تمہارا کس قدر شدت سے انتظار کررہا ہوگا؟''

''کرتا رہے،اس جیسے پتہ نہیں کتنے ہیں جو میرا انتظار کرتے ہیں ،آئی ڈونٹ کیئر۔''

اس کے انداز میں بے نیازی سے زیادہ نخوت تھی جو نادیہ کو ذرا بھی اچھی نہ لگی، صوفیہ میں ضرورت سے زیادہ غرور تھا۔ایسا ہونا کوئی حیران کن بات نہیں تھی حسن

کے ساتھ شر بھی تو ہوتا ہے جو کسی نہ کسی روپ میں اپنا اظہار کر دیتا ہے۔ وہ انتہائی خوبصورت تھی۔ دیوانہ کر دینے والے حسن کی مالکہ۔حسن ہو اور اس کے ساتھ انداز دلربائی بھی ہو تو کون اپنا آپ بچا سکتا ہے۔اسے بچپن ہی سے احساس تھا کہ وہ خوبصورت ہے اور اس کے حسن کی تعریف تب سے ہی ہوتی چلی آئی تھی، جب اس کا حسین چہرہ ہر ایک کی توجہ کا مرکز بن جاتا اور اس کا پرکشش سراپا نئے جزیروں کی تلاش پر اکساتا تھا۔وہ اپنے پرکشش حسن کی بدولت نجانے کتنے دلوں پر حکومت کرتی تھی۔ ان کتنوں میں اسے سب سے زیادہ چاہنے اور اپنا آپ وار دینے کی حد تک عشق کرتے والا ذیشان ہی سمجھا جاتا تھا۔جس کا احساس نادیہ ہی کو نہیں صوفیہ کو بھی تھا۔

صوفیہ اور نادیہ رشتے کے اعتبار سے کزن تھیں مگر ان میں دوستی کا تعلق زیادہ گہرا تھا۔ایک دوسرے کی ہمراز' ہم خیال، رویے اور سوچ تک کو سمجھنے والی گہری سہیلیاں۔ کہتے ہیں کہ اس دنیا میں ہم خیال کا مل جانا ہی جنت ہے اور ان دونوں کی اپنی دنیا تھی جہاں وہ بہت خوش اور پرسکون تھیں۔اردگرد کے تمام لوگ انہیں بہنیں ہی خیال کرتے۔ ان کے گھر والوں کو ان کی دوستی پر اعتراض تو کیا کبھی اعتراض کرنے کا خیال بھی نہیں آیا تھا۔

نادیہ سمجھتی تھی کہ ذیشان کی کیا کیفیات ہیں اور یہ بھی جانتی تھی کہ صوفیہ کو اس کی ذرا بھی پرواہ نہیں ہے۔وہ ذیشان کا شمار انہی میں کرتی تھی جو اپنا دل ہتھیلی پر رکھے اس کے امیدوار تھے۔نادیہ خود بھی خوبصورت تھی لیکن اس کے حسن میں صوفیہ کے حسن جیسی کشش نہیں تھی جو دیکھنے والے کو ساکت کر دے۔اسے کبھی بھی صوفیہ سے حسد محسوس نہیں ہوا تھا لیکن جب وہ کسی کو شمار میں نہ لاتی تو اسے وہ بہت بری لگتی۔اسے غصہ بھی بہت آتا اور اس سے نفرت بھی کرنے لگتی۔وہ جب بھی ایسا محسوس کرتی تو بلا جھجک اس سے بحث میں الجھ جانے کی حد تک بات کرتی۔ان دونوں کے درمیان یہی ایک واحد موضوع تھا جس سے صوفیہ دامن بچا جاتی نہ کوئی رائے، نہ تبصرہ، نہ کوئی گفتگو۔اس بارے صوفیہ کیا نظریہ رکھتی ہے، نادیہ کبھی بھی نہ جان پائی۔اس وقت بھی صوفیہ کے نخوت بھرے انداز پر اسے شدید غصہ آ گیا، اس نے موقع کی مناسبت سے خود پر قابو پایا اور بڑے تحمل سے بولی۔

"صوفیہ! تمہیں ذیشان کے بارے میں سوچنا ضرور چاہیے۔"

"وہ کیوں؟"

صوفیہ نے عام سے انداز میں کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے لاپرواہی سے کہا۔

"وہ اس پوزیشن میں ہے کہ تمہیں، تمہارے والدین سے مانگ لے اور تمہیں حاصل کرنے کے لیے ایسی کوئی رکاوٹ بھی نہیں ہے اس کے لیے۔میں اس بات سے ڈرتی ہوں کہ کہیں تم کوئی ایسی بات نہ کہہ بیٹھو جس سے وہ انا کا مسئلہ....."

"اُو نادیہ! تم بے جا سوچوں کی الجھن میں پھنسی رہتی ہو۔جب ایسا کوئی وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا۔ پہلے سوچ سوچ کر دماغ خراب کرنے سے کیا حاصل؟"

اس بار صوفیہ نے قدرے سنجیدگی سے سمجھانے والے انداز میں کہا تو نادیہ نے بھی اسی لہجے میں کہا:

"دیکھو! وہ تمہیں اس قدر چاہتا ہے کہ....."

نادیہ نے کہنا چاہا تو صوفیہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

"خدا کے لیے نادیہ! چاہتیں کیا ہوتی ہیں، مجھے اس پر کچھ نہیں کہنا اور نہ ہی کہوں گی۔ وہ چاہتا رہے میں نے کب منع کیا ہے اور نادیہ! جس طرح وہ اپنی چاہت کا حق جتا رہا ہے اور تم بھی اس کا اقرار کر رہی ہو تو پیاری یہ اس کا طرز عمل ہے میرا نہیں۔ جس طرح وہ اپنی چاہت میں اپنی مرضی کا مالک ہے۔تم مجھے یہ حق کیوں نہیں دیتی ہو کہ میں اپنی مرضی سے اس کی چاہت قبول کروں یا نہ کروں۔"

"صوفیہ! وہ اس پوزیشن میں....."

"وہ ہے یا نہیں ہے، مجھے اس سے بھی غرض نہیں.....میں نے کہا نا جب وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا۔تم قبل از وقت سوچ کر ہلکان مت ہو میری جان۔" اس نے نادیہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے پیار سے کہا۔نادیہ خاموش رہی تو وہ بولی: "بے جا سوچیں آکاش بیل کی طرح ہوتی ہیں، انسانی صلاحیتیں تو کیا، ذہنی قوتوں کو بھی الجھا کر ختم کر دیتی ہیں۔ان سے بچو اور زندگی سے لطف اٹھاؤ۔"

اس کے یوں کہنے پر وہ خاموش ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد انہیں شامیانے لگے نظر آ گئے۔صوفیہ نے جلدی سے پرس میں سے آئینہ نکالا اور ایک نظر میں اپنے چہرے کا

جائزہ لے کر مطمئن ہوگئی۔ اسی آئینے میں نادیہ نے بھی ایک نظر ڈالی۔بس رینگنے والے انداز میں چلتی ہوئی رک گئی۔

''لوجی پہنچ گئے۔''

صوفیہ نے نادیہ کی طرف دیکھ کر شوخی سے کہا تو وہ ہنستے ہوئے بولی

''جی ہاں پہنچ گئے۔اب یہاں کے لڑکوں کی خیر نہیں۔''

'' ارے یہ تو ہوگا، مگر اس میں اپنا کیا قصور۔''

اس نے کاندھے اچکاتے ہوئے بھولپن سے کہا تو نادیہ نے بھی چوٹ کی۔

''قصور کا تو مجھے پتہ نہیں مگر گنتی بھی تو مجھے ہی رکھنا پڑے گی اور وہ ذیشان تو سمجھو ڈھیر ہی ہوجائے گا۔''

''نادیہ ڈیئر! گھبراؤ مت'اس طرح تو ہوتا ہے،اس طرح کے کاموں میں۔''

وہ ہنستے ہوئے بولی؛

''اچھی شامت ہے۔''

''شامت وامت کچھ نہیں ،بس مزا لیا کرو۔''

صوفیہ نے کہا تو نادیہ شیشے میں سے باہر دیکھتے ہوئے بولی؛

''وہ دیکھو! ذیشان کس سج دھج سے کھڑا ہے۔''

صوفیہ نے اس کی نگاہوں کی سیدھ میں دیکھا تو اسے ذیشان دکھائی دیا۔تبھی صوفیہ کی نظر اس کے ساتھ کھڑے ایک لڑکے پر پڑی۔ ایک لمحہ کو اس کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ اک لہر پورے وجود میں سنسناہٹ پیدا کرگئی۔ اس نے دیکھا، وہ لڑکا وجیہہ، نفیس، خوب رُو اور خوش پوش تھا۔اس نے ذرا غور سے دیکھا۔وہاں ایک اور ہی قسم کا تقدس تھا جس نے اس کے چہرے کو سنہری ہالے میں لیا ہوا تھا۔ وہ اس کی آنکھوں میں یوں اترا جیسے گہرے بادلوں میں سے سورج ایک لحظہ کے لئے اپنا آپ ظاہر کرے اور پھر انہی بادلوں کی اوٹ میں چھپ جائے۔

''کوئی یوں بھی اپنی اہمیت جتا جاتا ہے' بنا پوچھے' بنا کہے۔''

اس کے اندر سے اعتراف بھری آواز ابھری تو وہ چونک گئی۔ایک لمحہ کے لئے تو وہ حیرت کے بھنور میں ڈوب گئی مگر جلد ہی اس کے غرور نے اسے بچالیا۔اس نے من

ہی من میں ہنکارا بھرا۔

''میں اور اس سے متاثر ہوجاؤں'اس سے...... کیا میری تلاش اس پر تمام ہوگئی ہے۔نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔''

اس کی یہ مزاحمت محض اپنا بھرم رکھنے کے لئے تھی۔جس کا اظہار اس نے طنزیہ انداز میں کرتے ہوئے کہا۔

''اس کے ساتھ کوئی نیا ہی چہرہ لگتا ہے......''

''ہاں، ہے تو ٹھیک ٹھاک شے مگر...... تمہیں دیکھے گا ناتو......''

نادیہ نے سرسراتے ہوئے کہا اور ہنس دی۔جس پر صوفیہ کی انا کو تسکین ملی۔تب اس نے شوخی سے کہا۔

''تمہیں کہا ہے ناڈیئر! اس طرح تو ہوتا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے واضح طور پر اپنے لہجے میں کھوکھلا پن محسوس کیا جسے نظر انداز کرتے ہوئے وہ بولی ''چلو اب اٹھو سبھی اتر گئے ہیں۔اس تانکا جھانکی میں آخری مسافر ہم ہی رہ گئے ہیں۔''

صوفیہ اٹھی تو نادیہ چشمہ لگاتے ہوئے کھڑی ہوگئی۔وہ دونوں جیسے ہی بس سے اتریں۔تب صوفیہ نے لاپرواہی سے ادھر ادھر دیکھا جیسے اسے ذیشان اور محمود کھڑے نظر ہی نہ آئے ہوں۔جبکہ نادیہ ان دونوں کو چشمکے سیاہ شیشوں میں سے بغور دیکھ رہی تھی۔

اس سے پہلے کہ وہ قدم اٹھاتی۔اس کی حیرت نے ہی اسے ساکت کردیا۔ذیشان کے ساتھ کھڑا لڑکا صوفیہ کو دیکھ کر ہل جانے والے انداز میں چونکا تھا۔تبھی اس نے سرگوشی کی۔

''صوفیہ! ذیشان کے ساتھ کھڑا لڑکا تو ایک جھٹکے ہی میں گیا کام سے، کیا حالت ہو رہی ہے اس کی۔''

نادیہ کے لہجے نے اس حیرت کو مزید گھمبیر بنادیا تھا۔

''واقعی......!''

صوفیہ کو خود حیرت کا جھٹکا لگا جیسے اسے یقین نہ آرہا ہو کہ ایسے ہوگا۔اس نے لاشعوری طور پر اس لڑکے کی جانب دیکھا۔واقعی اس کی وہی حالت تھی جیسے نادیہ نے بتائی تھی۔ وہ سرشار ہوگئی۔خوشی سے اس کا دل جھوم اٹھا۔اسے پہلی بار اپنے حسن پر رشک آیا۔اس کے غرور نے اسے تھپکی دی۔

"لگتا ہے، پہلی نظر میں گیا اپنے کام سے۔"

نادیہ نے پھر سرگوشی کی تو وہ سرمستی میں بولی۔

"اسے گھائل کردینا کہتے ہیں پاگل۔"

یہ کہا اور قدم بڑھادیئے۔ صوفیہ نے ایک فاتح حکمران کی طرح محمود کو دیکھا اور روند دینے والے انداز میں قریب سے گزرتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔

وہ شامیانے کے اندر داخل ہوئیں تو دیگر مہمانوں کی طرح ان کا بھی استقبال کیا گیا، رشتہ داروں سے ملتے ملاتے نادیہ ان کے ساتھ باتوں میں کھوگئی لیکن صوفیہ کے اندر ایک بے چینی مچل اٹھی تھی۔ وہ اسی لڑکے سے متعلق سوچ رہی تھی۔ اس کے دل میں کچھ نہیں تھا لیکن ذہن پر خوشگوار حیرت طاری تھی۔ اس نے پورے انصاف سے سوچا تو اسے اس لڑکے کے چونک جانے میں انفرادیت محسوس ہوئی۔ آج تک کوئی بھی اسے دیکھ کر اس طرح نہیں چونکا تھا۔ اس کی حیرت میں نیا جہان دریافت کرلینے کی سی معصومیت تھی۔ انوکھی حیرت اور آنکھوں سے چھلکتا ہوا بے ضرر اضطراب۔

☆☆☆

ماحول بے کیف ہوگیا تھا۔

باراتی کھانا کھا چکے تھے۔ محمود اپنے پاپا کے ساتھ مہمانوں میں بیٹھا ہوا بے چین ہو رہا تھا۔ وہ شدت سے تنہائی کی خواہش کر رہا تھا جبکہ تنہائی اسے میسر نہیں آرہی تھی، اس کا ذہن الجھا ہوا تھا، کسی بھی سوچ کا سرا اس کے ہاتھ نہیں لگ رہا تھا۔ وہ یہ فیصلہ نہیں کرسکا تھا کہ رات دکھائی دینے والا واقعہ کیا تھا اور اسے وہ کیا سمجھے؟ پھر صبح وہی لڑکی......! اس قدر مماثلت، وہی سراپا، ویسے ہی ہلکے گھنگریالے بال اور وہی دیکھنے کا انداز جس میں بانکپن تھا۔ یہ تو ناممکن سی بات لگتی ہے کہ وہ رات کے دوسرے پہر میں یہاں تھی اور دن کے پہلے پہر میں وہ دوبارہ یہاں آگئی۔ یہی اس سوال کی پراسراریت تھی جس سے دھویں کی طرح کئی سوال اٹھ رہے تھے کہ سب کچھ گڈمڈ ہوکر رہ جاتا۔ جیسے کوئی شریر بچہ ایک رنگ کی تصویر کو رنگین پنسلوں سے رنگتے ہوئے بھدا کر کے رکھ دے۔

"کیا وہ واہمہ تھا......؟"

اس نے بڑبڑاتے ہوئے خود سے سوال کیا تو پاس بیٹھے ہوئے اس کے باپ نے ہنکارا بھرتے ہوئے پوچھا:

"ہوں--! کیا کہا تم نے؟"

"کچھ نہیں پاپا......بس ذرا سر میں......"

وہ جھوٹ کہتے کہتے رک گیا۔

"ہاں یار، یہاں شور بھی بہت ہے۔ تم جاؤ، جا کر تھوڑا سکون لے لو۔"

اس کے پاپا نے کہا۔

"لیکن یہ سب مجھے برا نہیں، اچھا لگ رہا ہے۔"

اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بہت خوب! مگر بیٹا، اپنی ماما کو اپنے سردرد کے بارے میں مت بتانا، ورنہ وہ یہیں ادویات کی دوکان کھول لے گی۔ جاؤ تھوڑی دیر آرام کرلو۔"

پاپا نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ بھی ہنس دیا۔ شاید وہ مزید بات کرتے مگر اس دوران اس کے پاپا کو کسی مہمان نے مخاطب کرلیا۔ وہ کچھ دیر ان کے درمیان ہونے والی باتیں سنتا رہا، پھر اٹھا اور شامیانوں کے گھٹے ہوئے ماحول سے نکل کر باہر کھلی فضا میں آ گیا۔ اسے ذیشان کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کا خیال آتے ہی وہ چہرہ اس کے ذہن میں ابھرنے لگا۔ بلاشبہ ذیشان اسی کے تعاقب میں ہوگا۔ اس نے سوچا، وہ حسن تھا ہی اتنا پرکشش کہ عشق کھنچا چلا جائے۔ ذیشان نے اس چہرے کا نام لیے بغیر ہی اپنے جذبات کا اظہار کر چکا تھا۔ وہ چہرہ اس کی کمزوری تھا۔ اس آگہی پر اسے حیرت نہیں ہوئی تھی۔ وہ دو طرح کی حیرتوں میں آن گھیرا تھا لیکن یہ دونوں حیرتیں آپس میں زمین و آسمان کا فرق رکھتی تھیں۔ محمود کے لیے وہ چہرہ معمہ تھا، اضطراب اور حیرت کا باعث تھا۔ یہ اضطراب اور حیرت زدہ کیفیت اسے بری نہیں لگ رہی تھی بلکہ اس میں ایک بے نام سی لذت تھی۔ ایک سنسنی تھی جو اس کے وجود میں پھیلی ہوئی اپنا احساس دلا رہی تھی۔ اردگرد کا سارا رنگین ماحول، اس کی کیفیات میں اپنا وجود کھو چکا تھا۔ خود فراموشی والی حالت اس پر چھا چکی تھی۔ وہ سوچتا رہا اور تنہائی کی طلب بڑھتی گئی۔ بے اختیار اس کا رخ نانی اماں کے گھر کی طرف ہوگیا۔

اس گھر میں خلاف توقع خاموشی نہیں تھی۔ کچھ خواتین تازہ دم ہوجانے کیلئے آرام کرنے کی خاطر وہاں آ گئی تھیں۔ وہ اپنے آپ سے الجھتا ہوا دوسری منزل پر جانے کیلئے زینے تک پہنچا۔ تبھی کسی نے اسے پکارا۔ پلٹ کر دیکھا تو سحرش تھی۔ اسے حیرت ہوئی کہ وہ سحرش کی آواز بھی نہیں پہچان پایا تھا۔ شاید یہ بے خودی کا تحفہ تھا۔

"آپ صبح سے دکھائی ہی نہیں دیئے۔"

سحرش نے اس سوال سے بات کا آغاز کیا تھا اور پھر وہ حسب سابق ایک ایک فرد کے بارے میں اپنی رائے اسی وقت کہہ دینا چاہ رہی تھی۔ وہ کچھ دیر تک اس کی

باتیں سنتا رہا۔ اسی دوران داخلی دروازے سے وہی دشمن جان چہرے والی آن وارد ہوئی۔ وہی چہرہ جو اس کے حواس معطل کر رہا تھا۔ وہ اس چہرے سے نگاہیں نہ ہٹا سکا تو اس بے مہر اور لاپرواہ چہرے پر رعونت بھری مسکراہٹ رینگ گئی۔ آنکھوں میں وہی احساس فتح مندی جس میں سحر زدہ کردینے والی کشش تھی۔ انہی لمحوں میں اسے آگہی ملی کہ اس سامنے وجود کے چہرے اور رات نظر آنے والے چہرے میں کیا فرق تھا۔ اس پرنخوت اور غرور ہے اور اس پرسکون اور نرماہٹ تھی۔ تبھی اس وجود سے اس کا من اُوب گیا۔ اس نے نظریں ہٹا کر کہا:

"اچھا سحرش! باتیں پھر ہوں گی، فی الحال میں آرام کرنے کے لئے جا رہا ہوں۔"

"ارے مستقبل کے ڈاکٹر صاحب! یہاں اتنی رنگینیاں ہیں اور آپ کو آرام سوجھ رہا ہے۔"

وہ قدرے شوخ لہجے میں بولی تو اس نے بات کا جواب دینا مناسب خیال نہیں کیا اور کسی طرف دیکھے بغیر زینے کی طرف لپک گیا۔ کمرے میں آجانے کے بعد وہ نڈھال سا بیڈ پر پھیل گیا۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ کسی انہونے واقعے نے اسے اتھل پتھل کر کے رکھ دیا تھا۔ یہ حقیقت تھی، واہمہ تھا یا پھر کوئی پراسرار طلسم؟ اس ہونے اور نہ ہونے کے درمیان پھنس کر وہ خود کو ٹوٹتا ہوا محسوس کرنے لگا۔ تبھی اس کے اندر ہی سے مزاحمت کی لہر ابھری، جس نے ان ساری بے چینیوں، اضطراب اور بے سکون کیفیت کو زائل کردیا۔ وہ سوچنے لگا کہ کیا میرا اس سے کوئی تعلق ہے جو میں اس کے متعلق سوچوں؟ اگر نہیں تو میں بے چین کیوں ہوں؟ جو شے میرے اندر انتشار کی پرورش کا باعث بنے اسے اپنی فصیل وجود سے نکال باہر کرنا چاہیے۔ اس خیال کے ساتھ ہی وہ شانت ہوتا چلا گیا۔ وہ محسوس کرنے لگا جیسے وہ کسی سبز پوش پہاڑوں کے درمیان بنے لکڑی کے کاٹیج میں پرسکون بیٹھا تھا کہ اچانک تیز ہواؤں نے سارا سکون غارت کردیا۔ اس نے بڑھ کر ساری کھڑکیاں بند کردیں، بے چین پردے ساکت ہوگئے اور اس نے باہر سے آنے والی ساری آوازوں کو گھر کی دہلیز سے باہر ہی روک دیا۔ یہ ایک ایسی بے اختیار لہر تھی جس کے بارے میں وہ پہلے نہیں جانتا تھا۔ یہ اجنبی کیفیت اس کے لئے بالکل نئی تھی مگر انتہائی لذت آمیز...... وہ پرسکون ہوگیا۔ تبھی نیند کی دیوی اس پر مہربان ہوگئی۔

☆☆☆

آدھے سے زیادہ دن ڈھل چکا تھا۔

وہ دونوں جیسے ہی نانی اماں کے گھر کے اندرونی داخلی دروازے سے اندر آئیں۔ ان کی نگاہ اسی لڑکے پر پڑی جس کے چونک جانے میں انفرادیت تھی، وہ سحرش سے باتیں کر رہا تھا۔انہیں دیکھ کر اس بار وہ چونکا نہیں، بس سوالیہ نظروں سے صوفیہ کی طرف دیکھتا رہا تھا۔یہ دورانیہ محض چند لمحوں کا تھا اور پھر وہ زینے کی طرف بڑھتا چلا گیا تھا۔تب نادیہ نے اسے زینے کے آخری سرے پر جاتے ہوئے دیکھ کر صوفیہ نے کہا۔

''لگتا ہے،کوئی انتہائی اہم قسم کی چیز ہے۔''

''ہوگی......! ہمیں کیا ؟''

صوفیہ نے اعتماد سے کہنا چاہا لیکن خود واضح طور پر اپنی آواز میں لرزش محسوس کرتے ہوئے چونک گئی۔اس لڑکے میں کچھ ایسا تھا جو وہ اپنی ذات میں ارتعاش محسوس کر رہی ہے۔ نادیہ کو اس کی کیفیت کا پتہ نہ چلا، وہ تیکھے لہجے میں بولی۔

''اکلوتی اولاد اور پھر دولت مندی ،دماغ تو خراب کر ہی دیتی ہے نا۔''

''وہ جو کچھ بھی ہے نادیہ،ہمیں کیا......ہم اگر چاہیں تو......؟''

اس نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔حسن اپنی سحر انگیزی سے واقف تھا۔

''ہاں صوفیہ! اگر تم چاہو تو......! لیکن پیاری، سچ کہتی ہوں، مجھے تو یہ ذرا الگ سی چیز لگی ہے۔''

نادیہ اب تک اس میں کھوئی ہوئی تھی۔

''یوں تو اس دنیا میں ہر کوئی منفرد ہے میری جاں......میں مانتی ہوں کہ وہ وجیہہ ہے ،خوبصورت ہے ،لیکن جان جی ! جس کے منہ میں ابھی دودھ کے دانت ہوں، وہ تو ابھی بچہ ہی ہوا نا،تم نے دیکھا نہیں تھا،وہ اپنی ماں سے کس قدر والہانہ ملا تھا۔ جیسے بچھڑے ہوئے صدیاں بیت گئی ہوں،یہ منفرد صرف اس لئے لگ رہا ہے کہ اس میں ابھی چھچھوری حرکتیں نہیں ہیں۔''

صوفیہ نے بے دردی سے اس کا تجزیہ کر ڈالا۔

''ٹھیک کہتی ہو تم......'' یہ کہتے ہوئے نادیہ نے کہا؛ ''چلو یار! سحرش ہی سے کہہ کر کوئی کمرہ تلاش کریں۔ تھوڑا آرام کر لیں،ابھی تو واپسی کا سفر بھی باقی ہے۔''

صوفیہ نے خاموش رہ کر اس کی ہاں میں ہاں ملائی تو وہ دونوں سامنے کھڑی سحرش کی طرف بڑھ گئیں۔

☆☆☆

"اٹھ جا یار!"

تیز دستک کے ساتھ ذیشان کی آواز سنائی دی تو وہ بیدار ہوگیا۔اس نے عادتاً گھڑی پر نظر ڈالی۔اسے سوئے ہوئے تقریباً دو گھنٹے ہو چکے تھے۔اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو ذیشان اس کی طرف دیکھ کر بولا

"ایک بات تو بتاؤ،تم اتنا سو کیسے لیتے ہو،تمہیں اتنی نیند کہاں سے آجاتی ہے؟" اس نے ذیشان کی بات کا جواب نہیں دیا بلکہ صوفے پر مخمور سا ڈھیر ہوگیا۔تبھی ذیشان کھڑے کھڑے تیزی سے بولا:"آپ کے لئے حکم ہے کہ تیار ہوجائیں،آپ بارات کے ساتھ جائیں گے اور کل ولیمہ میں شرکت کر کے ہی واپس آئیں گے۔"

"کس کی طرف سے ہے یہ حکم؟"

اس نے خمار بھرے لہجے میں لاپرواہی سے پوچھا۔

"آپ کے پاپا کی طرف سے" اس نے کہا پھر قدرے تفصیل بتا کر بولا:

"جلدی آجاؤ، میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔"

یہ کہتے ہوئے وہ باہر کی طرف لپک گیا اور محمود تیار ہونے لگا۔

وہ نچلی منزل پر آیا تو وہاں خاصا سناٹا تھا۔وہ کاندھے پر ہلکا بیگ لٹکائے تیز قدموں سے چلتا ہوا شادی والے گھر پہنچ گیا، جہاں دلہن رخصت ہو رہی تھی، اسے کار میں بٹھایا جا رہا تھا۔سبھی لوگ اس جذباتی منظر کی طرف متوجہ تھے۔جلد ہی اس نے اپنی ماما اور پاپا کو دیکھ لیا۔دونوں اسی کے انتظار میں تھے۔

"میرا خیال ہے،تم نے خوب آرام کرلیا ہوگا؟"

اس کے پاپا نے دھیرے سے کہا۔

"جی،میں سو رہا تھا جب ذیشان نے مجھے بتایا۔"

محمود کے لہجے میں قدرے استفسار تھا۔

"ہاں یار! میں نے سوچا کہ تم ہی چلے جاؤ۔آخر رشتہ داری کا معاملہ ہے۔"

پاپا نے ہلکے سے مسکراتے ہوئے کہا تو اس کی ماں نے تیزی سے کہا؛

"میں نے تمہاری آنٹی صغراں سے کہہ دیا ہے،تمہیں کوئی بھی پرابلم ہو،ان سے کہنا۔"

"ماما! میں اپنا خیال رکھ سکتا ہوں۔"

نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے لہجے میں باغیانہ سرسراہٹ در آئی۔ماما نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور اپنے پرس میں سے کافی سارے نوٹ نکال کر اسے دیتے ہوئے بولیں؛

"یہ رکھو،تمہارے کام آئیں گے۔"

"میرے پاس پہلے ہی کافی سارے ہیں۔"

وہ لاپرواہی سے بولا ؛

"اُور رکھ لو یار!"

اس کے پاپا نے کہا تو اس نے نوٹ پکڑ کر اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیے۔تبھی ذیشان نے اسے آواز دی۔ وہ ایک طرف کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا۔ وہ ماما اور پاپا سے الوداع ہوکر کار میں آن بیٹھا اور کچھ دیر بعد بارات واپسی کے لیے چل دی تو شام ہو رہی تھی۔ وہ دونوں خاموش تھے۔ذیشان ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ ان کی نگاہیں سیاہ تارکول والی سڑک پر جمی ہوئیں تھی۔ہلکی آواز میں موسیقی کار میں پھیلی ہوئی تھی۔

"ہم کب تک پہنچ جائیں گے؟"

شہر سے نکلتے ہی پہلا سنگ میل دیکھ کر محمود نے خاموشی توڑ ڈالی۔

"تقریباً پانچ گھنٹے۔"

ذیشان نے پر خیال لہجے میں نظر سیدھی رکھتے ہوئے کہا۔ یہ سنتے ہی اس نے

سیٹ سے ٹیک لگائی اور پھیل کر بیٹھ گیا۔تبھی وہ بولا؛

"محمود ڈیئر! تمہیں یہاں سب سے زیادہ کون سی لڑکی حسین اور خوبصورت لگی؟"

"کیا مجھے اس انداز سے بھی دیکھنا چاہیے تھا لڑکیوں کو؟"

وہ عام سے لہجے میں بولا۔

"اُونہیں! میرا مطلب ہے کسی بھی لڑکی نے تمہیں متوجہ کیا، میرا مطلب ہے پرکشش لگی؟"

اس کے لہجے میں دبا دبا جوش تھا۔

"سچ پوچھتے ہو ذیشان تو مجھے کوئی بھی ایسی نہیں لگی۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے خود اپنے لفظوں کی حقیقت پر غور کیا تو لمحہ بھر میں اسے اپنے لفظوں کی سچائی کا یقین ہوگیا۔وہ مطمئن تھا کہ اس نے جھوٹ نہیں بولا۔

"کمال ہے محمود! گویا تم میری بات کا مذاق اڑا رہے ہو۔تم اسے ذرا دوسری طرح سمجھنے کی کوشش کرو......" یہ کہتے ہوئے وہ چونک گیا پھر بولا" لگتا ہے تم صبح کی بات پر ناراض ہو۔" ذیشان نے کہا تو وہ خاموش رہا کہ کیا جواب دے۔اسے ناراض ہونے کی ضرورت ہی نہیں تھی کہ وہ ان لمحوں کو بھول چکا تھا۔چند لمحوں بعد وہ کہتا چلا گیا

"یار......! اس وقت فرصت نہیں تھی جو میں تمہیں بتاتا۔میں تو خود اپنی جان جاناں کی باتیں کرکے سکون محسوس کرتا ہوں۔میں چاہ رہا تھا کہ ذرا سکون سے،آرام سے،جب ذرا لمبا وقت ہوگا تو بتاؤں گا کیونکہ ذکر جاناں ہو اور وہ چھلکے نہیں ایسا تو نہیں ہوسکتا نا۔"

محمود پھر خاموش رہا تو ذیشان نے کہا

"خیر! سنو، مجھے ایک لڑکی اچھی لگتی ہے۔اچھی کیا لگتی ہے،میری تو جان جاناں ہے۔عشق ہے کہ سرگرداں ہے اس کی راہ میں اور حسن ، اس میں تو ادائیں ہوتی ہیں۔سمجھ لو کہ صحرائی ہرنی ابھی ہمارے قابو میں نہیں آئی۔"

"تمہیں معلوم کہ وہ بھی تمہارے لئے ایسا ہی کوئی جذبہ رکھتی ہے؟"

"معلوم۔! ارے یار یقین ہے یقین۔" ذیشان نے کھوئے ہوئے انداز میں کہا۔کوئی ایسی بات تھی جس سے اس کے لہجے کا کھوکھلا پن عیاں ہوگیا تھا۔شاید اسی لئے

وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا ؛" چلو تمہیں بتا ہی دیں۔کیا یاد کروگے۔تم نے وہ لڑکی دیکھی تو ہوگی صوفیہ! وہ جو سب سے زیادہ حسین اور پرکشش تھی۔"

اس نے کہا تو محمود کی سوچوں میں کھلبلی مچ گئی۔ایسا اس لئے نہیں ہوا کہ ذیشان نے "انکشاف" کیا تھا۔وہ تو اسے پہلے ہی سے احساس تھا۔بلکہ وہ پھر "حقیقت اور واہمہ" کے اسرار میں آ پھنسا تھا۔چند ساعتوں تک اس کی یہی کیفیت رہی پھر اس نے سر جھٹک دیا۔ ذیشان کہے چلا جارہا تھا۔" وہ مجھے بہت اچھی لگتی ہے اور میں فیصلہ کرچکا ہوں کہ شادی بھی اسی کے ساتھ کروں گا۔"

" وہ تمہیں اچھی لگتی ہے اس لئے تمہیں وہ سب سے زیادہ حسین اور پرکشش دکھائی دیتی ہے۔ضروری نہیں کہ کوئی دوسرا بھی ایسا ہی محسوس کرے۔ خیر، میں پھر وہی بات کروں گا کہ کیا وہ بھی یہی چاہتی ہے۔میرا مطلب ہے تمہیں اس نے کوئی آس دلائی، کوئی وعدہ ،کوئی پیمان۔"

"اس نے کبھی اپنی کسی ادا سے مجھے یہ بھی باور نہیں کرایا کہ میں اسے ناپسند ہوں۔ میری پسند کے بارے میں میرے والدین بھی آگاہ ہیں۔وہ بھی چاہتے ہیں اور سب سے بڑھ کر وہ میری فرسٹ کزن ہے اور میری دسترس میں ہے۔"

" یہ سلسلہ کب سے چل رہا ہے؟"

اس نے یونہی بات بڑھائی۔

"شاید صدیوں سے......!"

ذیشان نے پیار کے احساس میں بھیگے ہوئے لہجے میں کہا۔پھر وہ صوفیہ کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ اس نے اتنی باتیں کیں کہ محمود سمجھ گیا،ذیشان اس خوبصورت اور پرکشش لڑکی کی محبت میں پور پور ڈوبا ہوا ہے۔باتیں ختم نہ ہوئیں لیکن سفر نے اپنی انتہا کو چھولیا۔محمود کی یہ کوشش رائیگاں گئی کہ معلوم ہوسکے ، وہ چہرہ کہیں ان لوگوں کی شرارت تو نہیں تھا؟

اگلی صبح محمود کی آنکھ کھلی تو وہ کمرے میں تنہا تھا۔رات گئے تک اسی کمرے میں ہلچل مچی رہی تھی۔ یہیں کھانا کھایا گیا، دیر تک گپ شپ ہوتی رہی اور پھر یہیں ذیشان کے ساتھ اس کا ایک اور کزن ارشد بھی سویا تھا۔ اس وقت وہ دونوں ہی نہیں تھے۔وہ تنہا

کچھ دیر خالی الذہن بیڈ پر پڑا رہا، پھر باتھ روم میں چلا گیا۔ منہ ہاتھ دھو کر جب وہ کمرے میں آیا تو تر و تازہ تھا۔ اس نے کھڑکی کا پردہ ہٹایا اور باہر دیکھنے لگا۔ یہ اس گھر کی دوسری منزل تھی۔ وہاں سے پچھواڑے کی سنسان گلی اور تاحد نظر گھروں کی ویران چھتیں دکھائی دے رہی تھیں۔ اسے یہ منظر اچھا نہیں لگا۔ وہ پلٹا اور دوسری جانب برآمدے میں آ گیا۔ جہاں پہلے ہی سے ذیشان کھڑا تھا۔ اس کی تمام تر توجہ نیچے کی طرف کمروں میں سے ایک کمرے کے دروازے پر تھی۔ وہ محمود کو دیکھ کر چونک گیا اور بڑے خوشگوار لہجے میں بولا؛

"جاگ گئے۔"

شاید اسے بات کہنے کے لئے کچھ اور نہیں سوجھا تھا۔

"جی......!" اس نے ہنکارا بھرا۔ پھر گہرا سانس لیا اور ماحول کو محسوس کرتے ہوئے بولا؛ "کس قدر سناٹا ہے مگر موسم خوشگوار ہے۔ ایسے وقت میں بندہ نہ اداس ہو سکتا ہے اور نہ ہی خوش......"

"محمود پیارے، موسم تو کبھی اندر کے ہوتے ہیں۔"

اس نے ایک پرانی بات کہہ دی۔

"ہاں! یہ تو ہے خیر یہ بتاؤ یار، کیا یہی گھر شادی والا ہے، لگتا ہی نہیں۔"

"یہ شادی والا گھر اس لئے نہیں لگ رہا کہ ولیمہ شادی ہال میں ہوگا جو یہاں سے ایک دو گلیاں چھوڑ کر بڑی سڑک پر ہے۔ سب لوگ وہیں جائیں گے۔ یہاں جو تھوڑے بہت مہمان ہیں، وہ آرام کر رہے ہیں۔ وقت تو دیکھو، ابھی تو سات ہی بجے ہیں۔"

"اچھا تو یہ بات ہے۔"

محمود یہ کہہ کر اس گھر کے ماحول کی طرح خاموش ہو گیا۔

اس سے پہلے کہ ان میں کوئی مزید بات چلتی، انہیں صحن میں ارشد دکھائی دیا، اس کے ہاتھ میں ایک سرخ سیب تھا۔ اس نے وہیں اشارے سے ناشتہ کرنے کے لئے پوچھا، جس پر ذیشان نے اونچی آواز میں "ہاں" کہہ دیا۔ وہ مڑنے لگا تو نجانے اس کے من میں کیا آئی۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا سیب ان کی طرف اچھال دیا۔ دونوں ہی

نے اسے پکڑنے کے لئے ہاتھ پھیلا دیئے۔ تبھی اگلے ہی لمحے وہ محمود کے ہاتھوں میں تھا۔ اس نے سیب صاف کرتے ہوئے ہنس کر کہا۔

"یہ تو میری قسمت کا ہے میرے بھائی، اسے تو میں ہی کھاؤں گا۔"

"میں کون سا اس میں سے حصہ بانٹ رہا ہوں، میرے لئے اور آ جائے گا۔"

ذیشان نے ارشد کو مڑتے ہوئے دیکھ کر محمود کو جواب دیا۔ تبھی وہ بات بڑھاتے ہوئے بولا۔

"ذیشان یہ تو بتاؤ' تم صبح ہی صبح یہاں برآمدے میں کیوں براجمان ہو۔ تمہارا کوئی بھی کام بلاجواز تو نہیں ہوتا نا؟"

"یہ بات تم نے محض بات بڑھانے کے لئے کہی ہے یا اس کا کوئی خاص مقصد ہے؟"

ذیشان نے دبے دبے جوش سے کہا۔

"ان دونوں باتوں میں سے جو بھی تم سمجھ لو۔"

اس نے سیب کاٹتے ہوئے آرام سے کہہ دیا تو ذیشان جھلّی پن سے بولا؛

"جتنے تم سادہ سے، بھولے سے دکھائی دیتے ہونا، اتنے ہو نہیں، بہت گہرے ہو۔"

"یہ میری بات کا جواب نہیں ہے۔"

اس نے اطمینان سے کہا تو ذیشان چند ساعتیں خاموش رہا۔ پھر نچلی منزل کے برآمدے میں دروازوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا؛

"صوفیہ، ان میں سے ایک کمرے میں ٹھہری ہوئی ہے۔ میں اس لئے یہاں کھڑا ہوں کہ شاید......دیدار ہو جائے۔"

ذیشان نے کسی تاثر کے بغیر آرام سے کہہ دیا۔

"یار تم اس سے اتنی محبت کرتے ہو کہ اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے بھی بے تاب رہتے ہو۔ جب وہ نہیں ہوتی تو پھر تم کیا کرتے ہو؟"

اس نے عام سے انداز میں ایک گہری بات پوچھ لی۔ ذیشان جواب میں کچھ نہیں بولا۔ شاید اسے سمجھ ہی نہیں آئی تھی جب کہ محمود جانتا تھا کہ اگرچہ عاشقان کا سکون

صرف اور صرف وصل میں ہوتا ہے لیکن محبوب کی موجودگی تو دل سے محسوس کی جاتی ہے۔ آنکھیں تو بس دیکھنے کا وسیلہ ہوتی ہیں۔ وہ اس کی طرف سے کسی متوقع جواب کا منتظر رہا اور دانتوں سے سیب کاٹ کر کھاتا رہا...... یہاں تک کہ سیب کا درمیانی حصہ بچ گیا۔ محمود نے ایک نظر اس ٹکڑے کو دیکھا اور بے دھیانی میں نیچے کی طرف پھینک دیا۔ اسی لمحے ایک دروازہ کھلا، صوفیہ باہر آئی اور وہ سیب کا ٹکڑا اس کے عین پاؤں کے پاس آن گرا۔ صوفیہ نے اوپر دیکھا اور غصے کی زیادتی سے اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ بلاشبہ توہین کا احساس بھی اس میں شامل تھا۔ صورت حال لمحوں میں گھمبیر ہوگئی تھی۔ ذیشان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ماحول میں اچانک در آنے والے تناؤ کے لمحات کو ختم کر کے رکھ دے۔ وہ نہایت بے چارگی سے افسردہ انداز میں بولا؛

"صوفیہ! یہ میں نے نہیں پھینکا۔"

وہ جواباً کچھ نہ بولی، واپس اندر پلٹ کر دروازہ بند کرلیا۔ محمود کو ان لمحات میں ایسا جھٹکا محسوس ہوا جیسے پختہ فرش پر بلوریں گلاس ٹوٹ جائے۔

☆☆☆

صوفیہ اور نادیہ ایک ہی بیڈ پر پڑی کب کی بیدار ہوچکی تھیں۔ دونوں کو ایک دوسری کے جاگ جانے کا احساس تھا مگر کوئی بات کہے بنا آنکھیں موندے لیٹی ہوئیں تھیں۔ ان کے ساتھ کچھ اور لڑکیوں سمیت سحرش بھی سوئی ہوئی تھی۔ ان کے بارے میں انہیں معلوم نہیں تھا کہ وہ بیدار ہوچکی ہیں یا ابھی تک سو رہی ہیں، کمرے میں ملگجی سی روشنی تھی، کتنی ہی دیر بعد نادیہ نے کروٹ بدل کر آہستگی سے کہا؛

"صبح ہوگئی ہے، اب اٹھ جاؤ۔"

"تم اٹھ گئی ہو نا، بس ٹھیک ہے۔ اب دوسروں کے لئے صور مت پھونکو۔"

"اچھا بابا، پڑی رہو مُردوں کی طرح، میں تو چلی، جا کے آنٹی کی مدد کروں، مہمانوں کو ناشتہ بھی تو دینا ہے۔"

"سگھڑ لڑکیوں کے یہی وطیرے ہوتے ہیں۔ جاؤ، آخر اسی گھر سے تمہارا مستقبل وابستہ ہے۔"

صوفیہ نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا، تبھی باہر سے اونچی آواز میں "ہاں" کا لفظ سنائی دیا۔ انہوں نے چونک کر ایک دوسری کو دیکھا اور ان کے چہروں پر معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی، جو دھیمی روشنی میں صاف دکھائی دے رہی تھی۔ تبھی نادیہ نے دھیرے سے سرگوشی کی؛

"وہ تمہارا رومیو بے چارہ نجانے کب سے تمہارے دیدار کے لئے اوپر برآمدے میں کھڑا سوکھ رہا ہے۔ اٹھو، اسے اپنے دیدار سے نوازو تا کہ اس بے چارے کے لئے بھی دن کی شروعات ہوں۔"

"مجھے اس طرح کے عاشقوں سے بڑی چڑ ہے،اب دیکھو،اسے میرے دیدار سے کیا مل جائے گا۔"

"یہ تو وہ ہی جانیں،جنہیں کسی کو دیکھنے کی حسرت ہو۔"

"یار نادیہ،کبھی کبھی تو میں اس کے طور طریقوں سے گھبرا جاتی ہوں۔ذرا سا بھی رومانوی نہیں ہے۔وہی پرانے عاشقوں کا انداز،زبردستی اپنا عشق جتانے کی گھٹیا سی کوشش۔"

صوفیہ نے زہر آلود لہجے میں منہ بناتے ہوئے کہا۔

"چلو اب اٹھ جاؤ۔منہ ہاتھ دھولو تا کہ اسے اپنا چہرہ دکھاسکو۔"

نادیہ نے کہا تو وہ بادل نخواستہ اٹھ گئی۔اس نے لاپرواہی سے منہ پر دوچار چھینٹے مارے،تولیے سے منہ صاف کر کے بالوں میں ہلکا سا برش کیا اور دروازہ کھولنے سے پہلے جھری میں سے دیکھا۔ذیشان کے ساتھ محمود بھی کھڑا تھا اور سیب کھاتے ہوئے اس سے باتیں کر رہا تھا۔اسے ہلکی سی حیرت ہوئی۔نادیہ بھی انہیں دیکھ چکی تھی۔صوفیہ حیرت زدہ لہجے میں دھیرے سے بڑبڑائی۔

"وہاں تو محمود بھی ہے۔"

"یہ بھی گیا کام سے......خیر نکلو تم......اسے پتہ نہیں ہوگا کہ ذیشان کی تمہارے ساتھ کیا......"

صوفیہ نے ان سنی کرتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔ایک نظر ان پر ڈالی تو اگلے ہی لمحے اس کے قدموں میں کھانے سے بچ جانے والا سیب کا ٹکڑا آن گرا۔اس پر صوفیہ نے اپنی شدید ہتک محسوس کی۔ایک لمحہ کے ہزارویں حصے میں وہ غصے سے بھر گئی۔

"یہ کیا کیا محمود نے؟میری اتنی ہتک" وہ توہین کے احساس سلگ اٹھی۔

اسی احساس کے ساتھ اس نے ان کی طرف دیکھا تو ذیشان نے جلدی سے کہا۔

"صوفیہ!یہ میں نے نہیں پھینکا۔"

وہ واپس مڑ گئی اور دروازہ بند کرلیا۔غصے کے باعث اس کی سانس تیز ہو رہی تھی۔نادیہ نے بدلے ہوئے تیور دیکھے تو ٹھٹھک گئی۔وہ کتنی ہی دیر تک بول نہ سکی اور

جب بولی تو لہجے میں آگ تھی۔

"یہ اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے۔فضول اور انتہائی گھٹیا حرکت ہے یہ......"

"ہوسکتا ہے، ایسا بے خیالی میں ہو گیا ہو۔تم نے یہ کیسے فرض کرلیا کہ اس نے جان بوجھ کر ایسا کر کے تمہاری توہین کی ہے؟"

نادیہ کے کہنے پر اسے احساس تو ہوا کہ ہوسکتا ہے ایسا ہی ہوا ہو لیکن اس کا دل نہیں مان رہا تھا۔وہ چپ رہی اور نادیہ کے ساتھ ہی نکل گئی تا کہ آنٹی کی مدد کر سکے۔

☆☆☆

ذیشان نے گھبراہٹ میں اپنی صفائی میں کہہ تو دیا کہ یہ میں نے نہیں پھینکا۔

اگلے لمحے جب صوفیہ دروازہ بند کر کے اندر چلی گئی تو اس نے اپنے لفظوں پر غور کیا۔ یہ صوفیہ کے غصیلے انداز پر لاشعوری ردعمل تھا۔ حقیقت تو یہی تھی۔ نہ اس نے ایسا کیا اور نہ ہی محمود نے جان بوجھ کر وہ سیب کا ٹکڑا اس طرح پھینکا تھا۔ محمود کے ذہن میں بھی نہیں تھا کہ ذیشان اس قدر خود غرضانہ انداز میں سوچے گا۔ اسے چاہیے تھا کہ کہتا، یہ ہم نے نہیں پھینکا۔ لاشعوری طور پر یا خوف کے عالم میں سچ ظاہر ہو ہی جاتا ہے۔ ذیشان کے چہرے پر خجالت آ گئی۔ اسے اپنی غلطی محسوس ہو گئی تھی۔ تبھی محمود ہنس دیا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ ذیشان اپنے عشق میں محض دعویٰ رکھتا ہے۔ جو شخص اپنی ذات پر قابو نہیں پا سکتا، وہ عشق جیسی قوت کو اپنے اندر کیسے برداشت کر سکتا ہے۔ عشق تو نری ہنگامہ خیزی کا نام ہے جو بندے کو جنون میں مبتلا رکھتی ہے۔ اس نے بے نیازی سے سوچا، صوفیہ اگر ذیشان سے ناراض ہو جاتی تو یہ ذیشان کے لئے بہت بڑی بات ہو سکتی ہے اور اگر وہ مجھ سے ناراض ہوتی ہے تو مجھے کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔ محمود قہقہہ لگا کر ہنس دیا اور اس غیر اہم واقعہ سے ماحول میں پیدا ہونے والے تناؤ کو دور کر دیا۔ ذیشان پہلے کی طرح چہکنے لگا۔

شادی ہال میں خاصی گہما گہمی تھی۔ وہ نوجوانوں کی ٹولی ہال سے باہر ہی کھڑی تھی۔ ذیشان اور ارشد کے ساتھ چند اور نوجوان کزن بظاہر ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے لیکن ان کی نگاہیں وہاں آنے والے مہمانوں پر لگی ہوئیں تھیں۔ جن میں مرد مرد حضرات بھی تھے اور خواتین بھی۔ انہی خواتین میں اگر کوئی پرکشش چیز نظر آتی تو سب کی نگاہیں اس کے بارے میں اظہار کر دیتیں۔ نجانے کیوں محمود کو یہ سب اچھا نہیں لگ رہا

تھا۔ حالانکہ وہ بھی انہی کے درمیان کھڑا تھا۔ تبھی نادیہ اور صوفیہ ایک کار سے اتریں۔ ان کے ساتھ دلہن بھی تھی جس نے بڑا سارا گھونگھٹ نکالا ہوا تھا۔ صوفیہ نے کسی کی طرف بھی نہیں دیکھا۔ اس کے چہرے پر تمکنت بھرا حسن مزید پرکشش ہو رہا تھا۔ وہ اس کے سامنے سے گزرتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ صوفیہ کی پشت پر پھیلے بال اسے نظر آئے۔ تبھی انہی لمحوں میں وہی چہرہ، وہی رات والا چہرہ اس سے کچھ فاصلے پر روشن ہونے لگا۔ جس طرح دھویں نے ایک پورے وجود کا روپ دھارا تھا، اسی طرح اس کے لئے سارے منظر دھندلا گئے۔

انہونی ہو چکی تھی۔ رات کی تاریکی میں اس کے سامنے ظاہر ہونے والا روشن چہرہ ایک بار پھر دن کے اجالے میں اپنی پوری تابناکی سمیت ان کے سامنے تھا۔ یہ حقیقت تھی یا واہمہ......؟ حقیقت میں تو اس چہرے کی مالکہ ابھی اس کے سامنے سے گزری تھی اور یہ......؟ یہ چہرہ جو اس سے کچھ فاصلے پر موجود تھا دھیرے دھیرے اس کے قریب آنے لگا۔ وہی مستی بھری چال، وہی دیکھنے کا والہانہ مستی بھرا انداز۔ وہ چہرہ اپنے سراپے کے ساتھ اتنا قریب آ گیا کہ وہ اس کا ایک ایک نقش اور چہرے پر موجود بے نام سی روئیں تک محسوس کر سکتا تھا۔ زندگی کا بھرپور احساس اس چہرے سے ہمک رہا تھا۔ چند لمحے، فقط چند لمحے اسی لذت انگیز سرشاری میں گذر گئے۔ وہ اپنا وجود بھول چکا تھا جیسے خلاؤں میں پہنچ کر بے وزن ہو گیا ہو۔ لمحوں کا یہ مجموعہ شاید طویل ہو جاتا کہ اس نے کسی کے لمس کا احساس کیا۔ اس نے گھبرا کر اپنے اطراف کا جائزہ لیا تو وہی شور، وہی قہقہے، وہی شادی ہال کے باہر کا منظر تھا۔ اس میں دلہن، نادیہ اور صوفیہ نہیں تھیں۔ وہ اس منظر سے ہٹ گئیں تھیں۔ وہیں اسے اس آگہی کا وجدان مل گیا کہ پہلی بار نظر آنے والا چہرہ کوئی سازش یا شرارت نہیں تھا۔

پھر کیا تھا......؟

اس سوال سے جہاں ایک پراسرار خوشی اسے نہال کر رہی تھی وہاں وہ ایک بے نام خوف کے دباؤ تلے آ گیا۔

تو پھر یہ کیا تھا؟

ایسے کیوں ہوا؟

میرے ساتھ ہی کیوں ہوا؟

سوالوں کے عفریت نے اس کی یکسوئی نگلنا چاہی۔

مجھے تتلیاں اچھی لگتی ہیں اس لئے بھی کہ وہ اپنی اڑان میں مسحور کن ردھم چھپائے پھولوں کو ترنم ریز گیت سنایا کرتی ہیں۔شاید انہی گیتوں کے ملائم اثر سے پھولوں میں خمار سلگ اٹھتا ہے۔میں نے تتلی کو چھوا نہیں مگر ہوا کی سرگوشیوں نے باور کرادیا کہ وہ پھولوں سے نازک ہوتیں ہیں ،اتنی نازک کہ اپنا رنگ انگلیوں کی پوروں پر چھوڑ جاتی ہیں۔ نازک پن کا ادراک اگر دل میں اتر جائے تو پھر نازک پن اپنے رنگوں سمیت خون میں شامل ہوکر سوچوں کو بھی رنگین کر دیتا ہے۔ایسے میں ذہن کی کائنات میں چھپے مہیب تاریک غاروں میں الاؤ بھڑک اٹھتے ہیں ،اتنے روشن ،اتنے جھلسادینے والے کہ ہوا بھی منہ سر لپیٹ کر چھپ جاتی ہے۔پھر ایک خلا جنم لیتا ہے جہاں تاحد نگاہ اندھیرے منظر دکھائی دیتے ہیں۔یہاں خود جلنا پڑتا ہے تب انہی اندھیرے منظروں میں سے رنگین سائے جھانکتے ہیں۔جو بہت حد تک تتلیوں سے مماثلت رکھتے ہیں۔

وہ مزید سوچنا چاہتا تھا مگر سوچنے کی مہلت نہیں تھی۔یہ سب جاننے کی خواہش شدت سے اس کے اندر چشمے کی طرح پھوٹ پڑی تھی۔

''محمود بھائی خیریت تو ہے،کیا ہوگیا ہے آپ کو......؟''

ارشد نے پوچھا تو وہ پوری طرح اپنے حواس میں آ گیا۔تب اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا:

''کیا ہوا ہے مجھے جو تم یوں پوچھ رہے ہو؟''

''یہ آپ ایک دم کہاں کھوگئے تھے اور یہ آپ کا چہرہ پسینے سے بھیگ گیا ہے، طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''

ارشد نے پوچھا۔

''میں ٹھیک ہوں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔حالانکہ اسے خود احساس تھا کہ اس کی مسکراہٹ بے جان ہے۔وہ خود کو بھلانا چاہ رہا تھا۔

''آؤ یار، ہال میں چلتے ہیں''

ذیشان نے کہا تو اس نے سکھ کا سانس لیا۔وہ سب ہال کی طرف بڑھ گئے۔

محمود کا دل دھڑک رہا تھا۔کچھ دیر پہلے کی کیفیت نے اسے بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ چہرہ ایک راز کی مانند اس پر منکشف ہوا تھا۔اس کے ساتھ پیش آنے والے واقعات ایسا معمہ تھے جن کی کوئی منطقی توجیہہ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔اس کے اندر اچانک بے چینی بڑھ گئی۔اس کا ذہن مسلسل سوچ رہا تھا لیکن وہ سب بے کار اور بے نام سوچیں تھیں۔ بالکل اس بازگشت کی طرح جو اونچے پہاڑوں کے درمیان گھوم گھوم کر ہوا میں تحلیل ہوجائے۔

اسی بے چین کیفیت میں اس نے کھانا کھایا اور ان سب کے درمیان سے اٹھ گیا۔ اسے خود پر غصہ آ رہا تھا کہ وہ اپنے آپ کو سمجھ کیوں نہیں پارہا۔وہ سوچ کی جس پگڈنڈی پر بھی چلتا، سامنے یہی سوال تن جاتا کہ ایسا ہو کیوں رہا ہے؟ وہ جس قدر سمجھنے کی کوشش کرتا، الجھتا رہا، اسے صرف یہی سوجھائی دے رہا تھا کہ یہاں وہ منتشر ہے۔ذرا بھی یکسوئی نہیں۔شاید اسے سمجھ آ جائے اگر وہ تنہائی میں بیٹھ کر اس پر غور کرے۔ ہوسکتا ہے کہ پھر وہ چہرہ اسے دکھائی نہ دے۔ ان شہروں سے نکل کر جب اپنے شہر میں جائے گا تو پھر کچھ بھی نہ ہو۔شاید ان شہروں کی فضا میں جادو گھلا ہوا ہے یا محض واہمہ کا نام ہی جادو ہے۔

اس نے اپنے تئیں ایک جواز بنالیا۔شاید یہ فرار کی ادنیٰ سی کوشش تھی۔

''محمود بھائی!آپ یہاں اکیلے میں کیا کررہے ہیں۔ ہم آپ کو ادھر دیکھ رہے ہیں؟''

ارشد نجانے کب اس کے پاس آ گیا تھا ،اس نے مخاطب کیا تو وہ چونکا۔

''بس یار کھانا کھایا ہے تو......''

اس نے جھوٹ سے بچنے کے لئے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا کہ وہ جو چاہے خود سمجھ لے۔

''آئیں ادھر چلتے ہیں سب کے پاس۔''

ارشد نے تجویز پیش کی تو وہ اس کے ساتھ چل دیا۔ شادی ہال کے باہر نوجوانوں کی ٹولی کھڑی تھی۔تبھی محمود نے ذیشان کو ایک طرف لے جا کر کہا۔

''کیوں جی، اب نکلیں یہاں سے،عشاء تک واپس پہنچ جائیں گے۔''

''میرا خیال ہے کہ آج رات رہیں یہاں پر،سبھی کہہ بھی رہے ہیں ،خوب گپ شپ لگے گی۔کل صبح چلیں گے۔''

ذیشان نے کہا۔

''نہیں، مجھے جانا ہے لیکن تم چاہو تو ادھر رہو۔''

''ناراض ہو......؟''

''اُونہیں یار، میں سوچ رہا تھا کہ یہاں سے تمہارے شہر تک کا سفر کیوں کروں، سیدھا اپنے شہر نکل جاتا ہوں۔''

اس نے کہا اور تھوڑی سی بحث کے بعد ذیشان کو محمود کی بات ماننا پڑی۔ وہ اسی وقت ارشد کو ساتھ لے کر پی سی او تک گیا اور اپنی ماما کو فون کر کے بتادیا کہ وہ سیدھا گھر جا رہا ہے آپ وہیں آجائیں پھر ریلوے بکنگ آفس سے رات دس بجے والی ٹرین کا ٹکٹ لیا اور ان کے پاس آگیا۔

☆☆☆

شام ڈھل رہی تھی۔

ارشد، نادیہ اور صوفیہ کے ساتھ ذیشان ایک کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔

''صبح کے واقعہ کا اثر اس طرح ہوگا، میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔''

''کیوں، کیا ہوا؟''

نادیہ نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا تو اس نے محمود کے واپس جانے کی بابت بتادیا۔

''میرا خیال ہے، ایسی کوئی بات نہیں۔ صوفیہ نے کون سا ردعمل ظاہر کیا ہے، جس سے وہ ناراض ہوجائے۔،، نادیہ نے کہا اور پھر چونک کر پوچھا۔'' محمود نے صبح کے واقعہ پر کوئی تبصرہ یا کوئی رائے دی ہے تمہارے سامنے؟،،

''یہی تو بات ہے کہ اس نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ خیر! یہ تو طے ہے کہ اچانک اس کے پروگرام کی تبدیلی میں کوئی بات تو ہے۔ اس نے میرے ساتھ جانا تھا واپس۔ لیکن اب وہ میرے ساتھ نہیں جا رہا اور سیدھا اپنے گھر جا رہا ہے۔،،

''تو بابا جائے، ہمیں کیا، اس کا جو پروگرام بھی بنے۔،، صوفیہ نے قدرے چڑتے ہوئے کہا۔

''ہمیں اس سے نہیں اپنے آپ سے غرض ہے۔ میں یہ چاہ رہا ہوں کہ اب وہ جا رہا ہے تو ہماری طرف سے اچھا تاثر لے کر جائے۔،،

ذیشان نے کہا۔

"اس کے لئے ہمیں کیا کرنا کیا ہوگا ؟"

نادیہ نے تیز لہجے میں پوچھا۔

"وہ رات دس بجے جارہا ہے۔ہم اس وقت تک اسے بھرپور کمپنی دیں ،جس سے اگر اس کے ذہن میں کچھ ہے بھی تو نہ رہے اور اگر نہیں ہے تو بہترین تاثر لے کر جائے۔"

"چلیں آپ کہتے ہیں تو ایسا کر لیتے ہیں۔ ورنہ ضرورت نہیں ہے۔"

صوفیہ نے ایک نظر نادیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ضرورت ہو یا نہ ہو۔کچھ دیر بعد ہم یہاں سے نکلیں گے۔اسے اچھے سے ہوٹل میں ڈنر دیں گے اور پھر اسٹیشن پر اسے الوداع کہہ دیں گے"۔

ارشد نے حتمی لہجے میں کہا تو صوفیہ بولی؛

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن میری رائے یہی ہے کہ وہ یوں اوٹ پٹانگ حرکتیں کر کے توجہ حاصل کرنا چاہ رہا ہے اور آپ لوگ اسے توجہ دے رہے ہو۔" پھر نادیہ کی طرف دیکھ کر بولی؛"میں نے کہا ہے نا وہ بچہ ہے اور بچوں جیسی حرکتیں کر رہا ہے، ثبوت حاضر ہے۔"

"نہیں صوفیہ! ایسا نہیں ہے۔تم اس سے ملی نہیں ہو، ورنہ یوں نہ کہتی ،وہ ہم سے زیادہ زندگی کو سمجھتا ہے۔دوسروں کے ان کہے جذبات کا بھی احساس ہے اُسے۔"

ذیشان نے بھرپور تاثر سے کہا تو ان میں خاموشی چھا گئی۔تبھی کچھ دیر بعد نادیہ نے پوچھا۔

"محمود اس وقت ہے کہاں؟"

"خاندان کے بزرگوں کے پاس بیٹھا الوداعی ملاقات کررہا ہے"۔

ارشد نے کہا اور اٹھ گیا۔

پھر سب کچھ وہی ہوا جو انہوں نے سوچا تھا۔ہوٹل میں ڈنر کے وقت ان میں گپ شپ ہوئی۔جس میں زیادہ ارشد اور نادیہ ہی باتیں کرتے رہے۔ وہ اسٹیشن پہنچے تو گاڑی تیار تھی۔ لوگ بیٹھ رہے تھے۔ وہ سب بھی اس کے ساتھ ڈبے میں آ گئے۔ڈبے میں خوشگوار خنکی تھی۔ محمود کی نشست وہاں تھی جہاں پہلے ہی سے ایک خاندان براجمان

تھا۔اس نے بیگ رکھا اور اپنے کزنز سے باتیں کرنے لگا۔ٹرین کی وسل بجی تو سب نے جلدی جلدی ہاتھ ملایا۔آخر میں صوفیہ تھی۔اس نے بھرپور نظروں سے محمود کا جائزہ لیا تو وہ مسکرادیا۔نجانے صوفیہ کو اس کی مسکراہٹ میں طنز کیوں محسوس ہوا۔اسے ذرا سا دھچکہ لگا پھر اگلے ہی لمحے بڑبڑائی

"بے چارا بچہ۔ !"اور واپس پلٹ گئی۔ٹرین چل دی۔اس نے کھڑکی سے دیکھا، ہاتھ ہلایا اور پھر سارے منظر بدل گئے۔

☆☆☆

مہینہ بھر میں دن ماضی کا حصہ بن چکے تھے۔

ان دنوں میں محمود کی زندگی کا بہاؤ ایک نئی صورت اختیار کرگیا تھا۔اس کے لئے باہر کے سارے منظر بے رنگ اور پھیکے ہوچکے تھے۔ وہ چہرہ اب اس سے اکثر ملنے کے لئے آجاتا تھا۔ وہ حقیقت تھی یا واہمہ! یہ سوال ہنوز تشنہ لب تھا لیکن اب اس کے لئے اتنا اہم نہیں رہا تھا۔ وہ چہرے کی رعنائیوں میں کھوجاتا تھا۔ وہ چہرہ جب بھی اس کی نگاہوں کے سامنے آیا ،ہربار وہی چہرہ ،وہی بال،وہی انداز دلربانہ ،وہی الوہی مسکان، وہی ہونٹوں پر پسینے کے ننھے جھلملاتے ہوئے قطرے۔ سرموفرق نہیں ہوتا تھا۔ اگرچہ پورا سراپا اس کے سامنے ہوتا تھا لیکن اس نے کبھی توجہ ہی نہیں دی تھی۔حقیقت تو یہ تھی کہ اسے چہرہ دیکھنے ہی سے فرصت نہیں ملتی تھی وہ بدن کے جزیروں کو جاننے کی کیا کوشش کرتا۔ وہ چہرہ یکدم ہی ابھرتا اور پھر معدوم ہوجاتا۔اس دوران وہ خود کو بے بس پاتا۔ اتنا بے بس کہ بڑھ کر چھونے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔وہ آتی ،کچھ دیر ٹھہرتی پھر اپنی موجودگی کی خوشبو پھیلا کر منظر سے ہٹ جاتی۔جب تک وہ نظر نہ آتی وہ اپنے کمرے تک محدود رہتا اور کتابوں کی دنیا میں کھویا رہتا۔

کبھی کبھی وہ بہت سوچتا کہ اس کے ساتھ ایسا کیوں ہورہا ہے؟ کہیں یہ کوئی مسئلہ تونہیں اس کے ساتھ؟ اس نے سوچا کہ وہ اپنی اس کیفیت کے بارے میں کسی سے کہہ دے مگر کہے کس سے؟ اسے کوئی جواب نہ ملتا تھا۔ اسے خود سے باتیں کرنے کی عادت ہوگئی تھی۔خود ہی سوال کرتا اور پھر خود ہی جواب دیتا۔ پھر اچانک ایک دن اسے شک ہوا کہ کہیں اس کا اپنا آپ ہی تو رکاوٹ نہیں ہے جو وہ خود اس لذت انگیز سرور

سے باہر نہیں آنا چاہتا، یہ حقیقت آشکار ہوتے ہی اس کے وجود میں طمانیت پھیل گئی۔ بلاشبہ اس کے پس منظر میں یہی لاشعوری خواہش ہے ورنہ کوئی بات نہیں تھی کہ وہ اس دائرے سے باہر نہ نکل سکے۔اسے یہ بھرپور احساس تھا کہ وہ پہلے سے زیادہ تنہائی پسند ہوگیا تھا۔ وہ نہ صرف تنہائی کی لذت سے آشنا ہوگیا تھا بلکہ تنہائی کا راز اس پر واضح ہوگیا تھا۔ وہ مطمئن تھا اور مسرور بھی۔ جس دن اسے وہ چہرہ نظر آجاتا۔ اس دن وہ انتہائی خوش ہوتا۔ وہ شیو بناتا، خوب نہاتا اور بہترین لباس پہن کر آوارہ گردی کے لئے نکل جاتا۔ اس کی منزل کوئی باغ ہوتا ،کتابوں کی دوکان یا پھر دریا کا کنارا۔نجانے ان میں کیا شے مشترک تھی؟ جو اس کی قوت ادراک کو تقویت بخشتی تھی، محمود اور چہرے کا یہی معمول تھا۔ وہ چہرہ سامنے آجاتا ،اپنی الوہی مسکان سے خوشبو پھیلاتا اور پھر نظروں سے اوجھل ہوجاتا۔ ہاں کبھی اس چہرے کا سامنے آجانے کا دورانیہ زیادہ ہوتا اور کبھی کم۔

اس دن بھی وہ کتاب پڑھنے میں محو تھا کہ ہلکا سا کھٹکا ہوا اس نے چونک کر دیکھا وہ دروازے سے اندر آکے کھڑی تھی۔کتاب اس کے ہاتھ سے پھسل گئی اور پھر ہر طرف سناٹا چھانے لگا......مکمل سناٹا...... اس نے دیکھا کہ وہ اس کے قریب آگئی ہے اس قدر قریب کہ وہ اس کی پلکوں کی چمک تک واضح دیکھ سکتا تھا۔وہ بے حس پڑا رہا اور وہ چند لمحے یونہی ساکت سے گذر گئے۔چہرہ ایک ٹک اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اچانک چہرے نے قہقہہ لگایا۔اس قہقہے کی بازگشت کے ساتھ ہی وہ سحر ٹوٹتا چلا گیا۔وہ معدوم ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ وہ غائب ہوگئی۔اس کے ساتھ ہی اردگرد کی ساری آوازیں ابھر آئیں۔ وہ پھر سے اپنے ماحول میں آگیا اور کتنی ہی دیر تک بے حس وحرکت پڑا رہا۔ اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا، دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔اک نئی طرح کی لذت آمیز سنسنی اس نے اپنے وجود میں محسوس کی۔ چہرے نے قہقہہ لگایا تھا اور یہی تبدیلی اس کے اندر تک ارتعاش پیدا کرگئی تھی۔وہ اس کے تصور میں کھوگیا۔کافی دیر بعد اس نے بستر پر گری کتاب اٹھائی، اسے سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور بھرپور انگڑائی لے کر بستر سے اتر آیا۔ اس نے کھڑکی سے پردہ ہٹا کر دیکھا ،شام آنگن میں اتر آئی تھی۔ وہ کپڑوں کی الماری کی طرف بڑھ گیا۔

وہ تیار ہوکر اپنے کمرے سے نکلا تو پرفیوم کی مہک اس سے آگے ہی آگے

چل دی۔ ہلکے آسمانی رنگ کے کاٹن شلوار سوٹ میں اس کا گورا رنگ اور نکھر آیا تھا۔وہ دائیں ہاتھ کی شہادت والی انگلی میں اپنی کار کی چابی گھماتا ہواڈرائینگ روم میں آیا تو چونک گیا۔اس کی ماما کے پاس سحرش بیٹھی ہوئی تھی۔اسے دیکھ کر محمود کو خوشگوار حیرت ہوئی۔

"ارے تم سحرش، کیسی ہو، کب آئی ہو؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں اور تھوڑی دیر پہلے ہی آئی ہوں"۔ پھر ذرا عجیب سے لہجے میں بولی؛"آپ کیسے ہیں،ٹھیک تو ہیں نا۔"

"میں......! بالکل ٹھیک ہوں۔"

اس نے انتہائی خوشگوار لہجے میں کہا اور اپنی ماما کے ساتھ بیٹھ گیا۔

"آپ بالکل ٹھیک نہیں ہیں جو اتنے دنوں سے فون تک نہیں کیا۔پہلے تو مصروف ہونے کے باوجود خیر خیریت دریافت کرتے تھے،اب تو......"

اس نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"سوری سحرش! بس ایسے ہی"۔

اس نے معذرت کرتے ہوئے بے ربط سا جملہ کہا۔

"آج پاپا نے ادھر کہیں کام آنا تھا تو میں بھی آ گئی"۔اس نے کہتے کہتے لہجہ بدل کر کہا"آپ کہیں کسی ضروری کام سے تو نہیں جا رہے؟"

"نہیں! کوئی بھی کام نہیں ہے۔بس ایسے ہی فضول آوارہ گردی کرنے نکلا تھا۔"

اس نے سچ کہہ دیا۔

"ایسے ہی آوارہ گردی کرتے کبھی ہمارے ہاں بھی آجایا کریں ، ہم بھی آپ کے کزن لگتے ہیں۔"

سحرش تو جیسے شرمندہ کرنے پر تلی ہوئی تھی۔تبھی اس نے خجالت سے کہا؛

"میں واقعی معذرت خواہ ہوں۔آئندہ تمہیں شکایت نہیں ہوگی۔"، پھر موضوع بدلنے کی خاطر اپنی ماما سے مخاطب ہو کر بولا؛"ماما کچھ لانا تو نہیں......میرا مطلب ہے کوئی خصوصی شے اس خصوصی مہمان کے لئے۔"

"سب کچھ ہے......! تم اگر باہر جانے کا بہانہ تلاش کر رہے ہو تو الگ بات ہے، ہم تمہیں نہیں روک رہے"۔ ماما نے پوری سنجیدگی سے شکایت بھرے لہجے میں کہا۔

"لو ماما جی ،کوئی بہانہ نہیں۔خیر سحرش تم بتاؤ آنٹی اور انکل کیسے ہیں،ساجد اور ماجد کا کیا حال ہے؟"

"سب ٹھیک ہیں"۔

وہ دھیرے سے بولی تو ان میں عام سی باتیں ہونے لگیں۔تبھی ماما نے کہا؛

"تم دونوں گپ شپ کرو ،میں ذرا کچن میں جھانک لوں۔دیکھوں تو صابراں کیا کر رہی ہے۔"

ماما گئیں تو چند لمحے ان میں خاموشی چھائی رہی ،پھر سحرش نے سکوت توڑا؛

"محمود آپ اگر باہر جانا چاہتے ہیں تو......!"

"نہیں سحرش میں نے کہا نا کہ وقت گذاری کے لئے جانا تھا۔اب تم آ گئی ہو تو بھلا میں کیسے باہر جا سکتا ہوں۔خیر! چھوڑو،آؤ لان میں بیٹھتے ہیں۔"

وہ دونوں اٹھے اور ٹہلتے ہوئے کھلی فضا میں،پھولوں سے بھرے لان کی خوش کن مہک میں آمنے سامنے بید کی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔سحرش نے شادی کی باتیں چھیڑ دی تھیں۔شادی کی تقریب ،وہاں پر آنے والے رشتہ دار ،ملنے جلنے والوں کی باتیں، رویے اور احساس۔ اتنے میں صابراں ٹرے میں جوس کے گلاس رکھے آ گئی۔اس نے جیسے ہی ٹرے میز پر رکھا ،محمود بے خیالی میں ہاتھ بڑھاتے ہوئے رُک گیا۔اس نے صابراں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"میں نے منع کیا تھا نا ،سیب والی کوئی چیز مجھے نہ دی جائے۔پھر بھی......؟"

"وہ جی......جی......بیگم صاحبہ نے بتایا اور مجھے کہا دے آؤ، میں نے نہیں......"

وہ ہکلاتے ہوئے بولی۔

"ٹھیک ہے تو پھر میرا گلاس لے جاؤ ،کسی اور پھل کا جوس لے آؤ۔"

محمود نے تحمل سے کہا۔صابراں ایک گلاس واپس لے گئی اس نے سحرش کی طرف دیکھ کر کہا۔

"تم لو!"

سحرش نے گلاس کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ وہ چند لمحے یونہی اس کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر ٹھہرے ہوئے پرسکون لہجے میں سنجیدگی سے بولی۔

''محمود! آپ مجھ سے بڑے ہیں اور شاید میرا حق بھی نہیں بنتا کہ آپ کے معاملات میں دخل دوں لیکن پھر بھی ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں۔،،

''ارے سحرش، اتنی تمہید، اس قدر تکلف، یہ تمہیں کیا ہوگیا ہے۔''

وہ حیرت سے بولا۔

''پھر بھی.....میں اجازت چاہوں گی کیونکہ مجھے پتہ ہے آپ جھوٹ نہیں بولتے۔''

''بھئی ہم دونوں کزن ہیں، بے تکلف ہیں۔ تم اگر کوئی بات پوچھنا چاہتی ہو تو بلا جھجک، بلا اجازت پوچھ سکتی ہو۔''

''یہ جو سیب کا جوس ہے، آنٹی نے جان بوجھ کر بھجوایا ہے تاکہ مجھے یقین ہو جائے کہ آپ سیب والی کوئی شے بھی نہیں کھاتے پیتے۔ محمود! ایسا کیوں ہے؟''

''او سحرش.....! اگر تم اتنی سنجیدگی سے پوچھو گی تو میں کچھ بھی نہیں بتاؤں گی۔''

اس نے ہنستے ہوئے کہا سحرش رو دینے والے انداز میں بولی۔

''مذاق نہیں.....''

''چلو ٹھیک ہے، میں بتائے دیتا ہوں لیکن تم بتاؤ، ماما نے ایسے کیوں کیا؟''

''میں آپ سے کچھ بھی نہیں چھپاؤں گی۔'' اس نے کہا اور پھر کہتی چلی گئی۔

''وہ کچھ دنوں پہلے ہمارے ہاں گئیں تھیں، انہوں نے بہت کرید کر مجھ سے وہاں کے حالات پوچھے۔ وہ پریشان تھیں، اس لئے کہ شادی سے آنے کے بعد آپ میں بہت زیادہ تبدیلی آگئی ہے۔ اس قدر تبدیلی کہ آنٹی چونک اٹھی ہیں۔ مثلاً یہی سیب والی بات لے لیں۔''

محمود نے تحمل سے سنا اور پھر قدرے سنجیدگی سے بولا؛

''ان کا چونک جانا اور میرے لئے پریشان ہونا فطری بات ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید میرا ممتا جیسے انمول جذبے سے ایمان اٹھ جاتا۔ وہ ٹھیک سوچ رہی ہیں۔ لیکن سحرش! اب میں بچہ تو نہیں، وقت اور عمر کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں آنا فطری امر ہے۔''

''مگر اتنی گھمبیر نوعیت کی تبدیلی، جس سے دوسرے پریشان ہوکر رہ جائیں؟''

''ماما بے جا پریشان ہورہی ہیں، تم سیب والی بات کہتی ہو تو سنو!''

یہ کہہ کر اس نے وہ واقعہ پوری جزئیات کے ساتھ بیان کردیا۔ اس دوران صابراں مینگو جوس رکھ گئی۔ تب سحرش نے اپنے جوس کا سپ لیتے ہوئے کہا؛

''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ آپ نے صوفیہ کے غصیلے چہرے کو اس قدر اہمیت دی کہ سیب جیسی نعمت سے دستبردار ہوگئے۔''

''نہیں، میں نے اسے اس انداز میں نہیں لیا۔ میرے سامنے جب بھی سیب سے بنی کوئی چیز آتی ہے تو مجھے ان لوگوں کے انتہائی خودغرضانہ رویئے یاد آجاتے ہیں اور میری طبیعت مکدر ہوکر رہ جاتی ہے۔ دماغ میں خواہ مخواہ غصہ بھر جاتا ہے۔ منفی جذبے، منفی رویے اور منفی سوچیں اپنے ذہن میں رکھ کر میں اپنے دماغ کو آلودہ نہیں کرنا چاہتا۔ ایسا میں نے کسی کے لئے نہیں کیا بلکہ خود اپنے لئے کیا ہے اور سیب جیسی نعمت کو میں نے خود پر حرام تو نہیں کرلیا۔ کچھ وقت بعد یہ معمول کے مطابق ہوجائے گا۔ باقی رہی تبدیلی کی بات تو یہ یقین کرلو کہ یہ بیرونی دنیا کے کسی معمولی سے بھی اثر کی وجہ سے نہیں ہے۔ یہ میرے اندر کی تبدیلی ہے۔ جسے نہ تم سمجھ سکتی ہو نہ ماما۔''

''پھر بھی، ہمیں بتائیں گے تو ہی سمجھ میں آئے گا۔ چلیں مجھے نہ بتائیں، اپنی ماما سے کہہ دیں، ان کی پریشانی دور ہوجائے گی۔''

''نہیں سحرش! میں انہیں بتاؤں گا بھی تو وہ سمجھ نہیں پائیں گے۔'' محمود نے کہا تو دونوں میں خاموشی آن ٹھہری۔ پھر وہ چند لمحوں بعد سمجھانے والے انداز میں بولا؛

''تم ایسا کرو، ماما سے کہو وہ پریشان نہ ہوں۔ میرے یہ خالی دن گذر جائیں گے تو میں پھر سے معمول پر آجاؤں گا۔''

''محمود کہنے کو تو آپ نے کہہ دیا، میں بھی آنٹی کو یقین دلادوں گی لیکن کیا اس تبدیلی کی کوئی وجہ نہیں ہے؟''

''ہاں، اس کی وجہ ہے لیکن میں نے کہا نا تم اور ماما اسے سمجھ نہیں سکتیں۔''

''لیکن آپ مانیں کوئی تو مسئلہ ہے نا؟''

"ہاں ہے، لیکن اس مسئلے سے کسی بھی دوسرے کو نقصان نہیں ہونے والا۔ حتیٰ کہ مجھے بھی۔" یہ کہہ کر وہ رک گیا اور پھر بڑبڑانے والے انداز میں بولا "یہ مسئلہ کسی وجود سے پیدا نہیں ہوا۔"

"خیر! یہ آپ کی اپنی زندگی ہے، مجھے تو آنٹی......"

"پھر وہی غیروں والی بات......!"

"آپ مجھے اپنا سمجھتے ہیں نا تو پھر میں یہ مسئلہ سمجھ کر رہوں گی۔"

"شوق سے محترمہ، شوق سے۔"

اس نے زندہ دلی سے کہا اور پھر ان کے درمیان باتوں کا موضوع ہی بدل گیا۔

☆☆☆

"ہاں بھئی نادیہ! بولو، اتنی جلدی میں کس لئے بلایا گیا ہے؟"

صوفیہ نے چادر اتار کر کرسی پر پھینکتے ہوئے کہا۔ پھر بیڈ پر نادیہ کے قریب بیٹھتے ہوئے جوتے اتارنے لگی۔ نادیہ کسی رسالے میں محو تھی۔ اس نے صوفیہ کی طرف دیکھے بغیر کہا؛

"ذرا سانس تو لو، بتاتی ہوں۔"

اس طرح کہنے پر صوفیہ نے رسالہ چھین کر سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر بولی:

"یہ تمہارے چہرے پر بارہ کیوں بجے ہوئے ہیں؟"

اس کے لہجے میں شوخی تھی جس پر نادیہ نے سنجیدگی سے کہا:

"سحرش کا فون آیا تھا......"

"تو اس میں اتنی سنجیدگی کا ہے کو؟"

وہ عام سے لہجے میں بولی۔

"اس نے باتیں ہی کچھ ایسی پوچھیں ہیں، جن سے میں پریشان ہوگئی ہوں۔"

اس نے کھوئے ہوئے انداز میں کہا۔

"کیا واقعی ایسی کوئی باتیں ہیں؟"

وہ منتشر لہجے میں بولی۔

"ہاں! اس نے بتایا ہے کہ محمود یہاں سے جانے کے بعد گوشہ نشین ہوگیا ہے۔ وہ ایسا کیوں ہوگیا ہے، یہ انہیں پریشانی ہے۔ دوسرا وہی سیب والا واقعہ! اس حوالے سے

اس نے بتایا کہ موصوف نے سیب کھانا ہی چھوڑ دیا ہے حتیٰ کہ اس سے بنی ہوئی کوئی چیز بھی۔ تیسری بات! وہ یہ پوچھنا چاہ رہی تھی کہ کہیں کوئی ایسی بات تو نہیں ہوئی جس سے محمود نے کوئی شدید اثر لیا ہو یا پھر کوئی ایسا اشارہ، کنایہ، جس سے پتہ چل جائے کہ کہیں وہ کسی پر دل تو نہیں ہار بیٹھے؟"

نادیہ نے ایک ہی سانس میں پوری تفصیل کہہ دی۔ صوفیہ نے ساری باتیں بہت غور سے سنیں اور کتنی ہی دیر تک خاموش رہی۔ پھر حتمی لہجے میں بولی؛

"سحرش بے وقوف ہے۔"

"بے وقوف وہ نہیں محمود کی ماما پریشان ہے۔ ظاہر ہے، تبدیلی واضح ہے تو ہی......"

"میں نے سحرش کو بے وقوف اس لئے کہا ہے کہ وہ اتنے قریب رہنے کے باوجود اسے سمجھ نہیں سکی، سنو! محمود جیسے لوگ متاثر نہیں ہوتے بلکہ متاثر کرتے ہیں۔"

صوفیہ کے لہجے میں حقیقت چھلکی تو نادیہ چونک گئی۔

"صوفیہ! یہ تم...... یہ تم کہہ رہی ہو، جو خود کسی کو اہمیت نہیں دیتی؟" اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

"میں مانتی ہوں کہ میں نے کبھی کسی کو اہمیت نہیں دی۔ وہ اس لئے کہ میری نظر میں کوئی جچا ہی نہیں تھا۔ محمود پہلا لڑکا ہے جو میرے مزاج اور معیار کے بہت قریب ترین ہے۔ یہ بات کہ اس میں تبدیلی آ گئی ہے۔ بہت سوچنے والی بات ہے اور وہ وجہ معلوم کرنا انتہائی ضروری۔"

"ایسا کیوں؟"

نادیہ کچھ نہ سمجھی تھی۔

"وہ اس لئے پیاری کہ جو شخص دوسروں کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، جب وہ خود کسی سے متاثر ہو جائے تو یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہوتا۔"

"صوفیہ......! اگر وہ تم سے......"

نادیہ کہتے کہتے رک گئی۔ اس کے لہجے میں دبا دبا جوش تھا۔

"تو میرے لئے ذرا سی بھی خوشی والی بات نہیں ہوگی۔ پھر وہ بھی عام لڑکوں کی

طرح ہوگا جو میرے ظاہری حسن کو دیکھ کر......"

شاید کچھ اور کہتی لیکن نادیہ نے بات کاٹتے ہوئے تیزی سے کہا؛

"سچ بتاؤ، کوئی ایسی بات، کوئی ایسا......"

"نہیں، تم بھی جانتی ہو...... ہاں، یہ الگ بات ہے کہ میں نے بعد میں بہت سوچا، تم سے بھی چھپا کر سوچا، اپنی ذات تک کو الگ کر کے سوچا۔ وہ جتنی دیر بھی میرے سامنے رہا ہے، اس کی ایک ایک ادا پر میں نے غور کیا ہے۔ وہ مجھے اچھا لگا ہے۔ اس میں اب بھی معصومیت ہے، یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ دنیا سے ابھی وہ آلودہ نہیں ہوا۔ لیکن اب اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں کوئی اس سے عشق جھاڑنے کے چکر میں ہوں۔"

"کل کیا ہوگا، میں یہ تو نہیں جانتی لیکن صوفیہ! ذرا سوچو۔ تمہاری اور اس کی جوڑی......؟"

نادیہ نے کہتے ہوئے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا جیسے کوئی شدید خواہش کے اظہار میں لفظ بھول جائے۔ یا پھر تصور میں ابھرنے والے منظر زبان سے کچھ کہنے ہی نہ دیں۔ صوفیہ نے اس کی طرف دیکھا مگر بولی کچھ بھی نہیں، ایک خوشگوار خاموشی ان کے درمیان در آئی تھی۔ پھر کتنی دیر بعد نادیہ نے پوچھا: "تو پھر میں سحرش کو کیا جواب دوں؟ یہی پوچھنے کے لئے میں نے تمہیں بلایا تھا۔ آج رات اس نے پھر فون کرنے کا کہا ہے۔"

"جو ہے، وہی بتا دو، مطلب خود سے کچھ بھی اوٹ پٹانگ کہنے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی یہ باتیں جو ہمارے درمیان ہوئی ہیں۔" یہ کہتے کہتے وہ رک گئی پھر چونک کر بولی "ویسے یہ بات سوچنے کی ہے پیاری کہ اگر اس میں یہاں سے جانے کے بعد تبدیلی آئی ہے تو وجہ کیا ہو سکتی ہے، ہمیں بھی تو معلوم ہونا چاہیے۔"

"میں نے سوچا ہے اور ایک ہی بات میرے ذہن میں آتی ہے اور وہ یہ کہ اسے تم پسند آ گئی ہو اور وہ ذیشان کی وجہ سے کوئی بھی اظہار نہیں کر پایا ہے۔"

"گھوم پھر کر تم مجھ پر ہی کیوں آن ٹکتی ہو، میں ہی کیوں، تم بھی ہو سکتی ہو؟"

"میں نے یونہی نہیں کہا، اس کے لئے بھی کچھ اشارے ہیں، دیکھو، سیب والا واقعہ میرے ساتھ نہیں ہوا تمہیں دیکھ کر چونک جانا، ذیشان کے ساتھ یہاں تک کھنچے

چلے آنا، اسٹیشن پر تمہارے لئے الگ سے ردعمل، یہ سب کیا ہیں؟ اس کی توجہ میری طرف ہوتی تو کچھ اور اشارے ہوتے۔''

نادیہ نے پوری سنجیدگی سے حالات کا تجزیہ کر ڈالا۔اس پر صوفیہ نے اپنی سفید مخروطی انگلیاں تھوڑی پر ٹکاتے ہوئے دیکھا، پھر دھیرے سے بولی:

''معاملہ جو بھی ہے لیکن ہے بڑا غور طلب'' یہ کہہ کر وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور نرم سے لہجے میں نادیہ کو سمجھاتے ہوئے بولی؛''یہ معاملہ ہم تک ہی محدود رہنا چاہیے۔ اس کا اظہار تم نے سحرش سے نہیں کرنا۔وہ کسی بھی شک میں نہ رہے۔اسے یہی یقین ہو کہ ہمیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، سمجھی تم۔''

''سمجھ گئی میری جان، چلو اب اٹھو، کچھ کھا پی لیں۔میری تو سوچ سوچ کر بھوک ہی اڑ گئی تھی۔''

یہ کہہ کر وہ اٹھی تو صوفیہ بھی اس کے ساتھ چل دی۔

☆☆☆

محمود کافی دیر سے اپنی ماما کے روبرو بیٹھا ہوا تھا۔ان میں بڑی گھمبیر خاموشی تھی۔ وہ انتظار کر رہا تھا کہ اس کی ماما کچھ کہے۔کافی دیر بعد وہ دھیرے سے بولیں؛

''میرے بیٹے! آخر کون سی ایسی بات ہے جس نے تمہیں پریشان کر رکھا ہے کیا مجھ سے اپنی پریشانی بیان نہیں کرو گے۔''

''ماما! پہلی بات تو یہ ہے کہ میں بالکل بھی پریشان نہیں ہوں اور اگر ایسا کچھ ہوا تو میں آپ ہی سے کہوں گا، اب جبکہ مجھے کوئی پریشانی نہیں ہے تو میں آپ سے کیا کہوں؟''

''یہ بچوں میں شدید غلط فہمی ہوتی ہے، جب وہ یہ سمجھیں کہ ماں ان کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتی یا ان میں ہونے والی تبدیلی کو پہچان نہیں پائے گی۔ نظر انداز کر دینا الگ بات ہے۔میں نے سحرش کے ذریعے بھی جاننے کی کوشش کی مگر......!''

''تو پھر کیا معلوم ہوا آپ کو، ذرا میں بھی تو جانوں؟'' اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا؛

''میرے اندازے ہیں، حتمی بات تو تم ہی کرو گے نا۔''

ماما نے قدرے بے چینی سے کہا۔

''ماما میں کیسے یقین دلاؤں کہ میرے ساتھ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ہاں اگر میرے معمول میں کوئی فرق آ گیا ہے تو ہم اسے کوئی مسئلہ تو نہیں کہہ سکتے۔ کچھ دنوں بعد میری ہاؤس جاب شروع ہوگی تو آپ کو میرا گھر دیر سے آنا بھی مسئلہ لگے گا۔ فکر مت کریں ماما......''

اس نے نہایت تحمل سے اپنی ماما کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے بیٹا! میری تو دعا ہے کہ تمہیں زندگی میں کوئی مسئلہ نہ ہو لیکن میری ایک بات مانو گے؟''

''جی بالکل، کیوں نہیں، آپ کہیں۔''

''تم آج شام ڈاکٹر شیرازی کے پاس جاؤ گے۔ میں نے تمہارے لئے ان سے وقت لیا ہے۔''

''ڈاکٹر شیرازی، وہی نفسیاتی معالج......''

وہ چونک گیا۔

''ہاں...... وہی......''

ماما نے کہا تو محمود ایک دم حیرت زدہ رہ گیا۔ چند لمحے تو اس سے بولا ہی نہیں گیا۔ اس دوران کئی سوچیں در آئیں۔ میری ماما اس قدر پریشان ہیں کہ وہ مجھے نفسیاتی معالج کے پاس بھیجنے کا فیصلہ کر چکی ہیں۔ ایسا کیوں ہوا؟

کیا میرا رویہ اس قدر اجنبی ہو گیا ہے؟

اگر معاملہ گھمبیر ہے تو مجھے احساس کیوں نہیں ہوا؟

کیا میں اپنے اندر کے ماحول میں اس قدر کھو گیا ہوں کہ باہر کی دنیا پر میری توجہ ہی نہیں رہی؟

تبھی لمحوں میں اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ڈاکٹر شیرازی کے پاس جائے گا۔ ایک تو ماما کی خواہش پوری ہو جائیگی۔ دوسرا اس کے اپنے لاشعور میں یہ گتھی موجود تھی وہ چہرہ آخر کیسے اس کے سامنے آ گیا؟ وہ اب تک دوسروں کے سامنے یہی کہتا چلا آیا ہے کہ اسے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ کیا واقعی ہی ایسا نہیں ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو وہ چہرے کی بابت کیوں نہیں سمجھ سکا؟ وہ حقیقت ہے واہمہ ہے یا کچھ اور......؟ اسے چہرے سے متعلق سمجھنا چاہیے۔ شاید ڈاکٹر شیرازی کی مدد سے وہ سمجھ جائے۔ اس طرح اس کی ماما بھی خوش اور مطمئن ہو جائیں گی۔ مجھے جانا چاہیے، اپنے لئے، اپنی ماما کے لئے۔ اگر چہ زندگی میں آنے والے نت نئے موڑ انسانی تجربات اور شعور میں اضافے کا باعث بنتے ہیں تاہم کبھی کبھی معمول کی زندگی کتنی بڑی نعمت لگتی ہے۔

''بیٹا تم نے جواب نہیں دیا۔''

ماما نے بڑے پیار سے پوچھا۔

''میں جاؤں گا ان کے پاس۔''

اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو اس کی ماما کے چہرے پر اطمینان پھیل گیا۔

ڈاکٹر شیرازی کا کلینک جدید علاقے میں تھا، جو نہایت پرسکون تھا۔ گیٹ کھلا ہوا تھا اس نے گاڑی لے جا کر پورچ میں کھڑی کر دی۔ چپراسی پھولوں سے لدے ہوئے برآمدے میں سے اٹھا اور قریب آ کر بڑے ادب سے بولا؛

''جی فرمایئے!''

''ڈاکٹر صاحب کو بتائیں، میرا نام محمود الحسن ہے۔''

اس نے سنا اور اندر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آ کے تیزی سے بولا؛

''ڈاکٹر صاحب آپ کا انتظار کر رہے ہیں آئیں تشریف لے آئیں۔''

وہ اسے خوبصورت کمرہ نشست میں لے آیا۔ اندر داخل ہوتے ہی اے سی کی خنک ہوا محسوس ہوئی۔ فضا معطر تھی۔ اس نے دیکھا سامنے تندرست، سرخی مائل، گوری رنگت اور سفید بالوں والا ڈاکٹر شیرازی بیٹھا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ کھڑا ہو گیا۔

''آیئے محمود صاحب۔! میں آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔ محمود نے ہاتھ ملایا اور اس کے ساتھ ہی رکھے صوفے میں دھنس گیا۔ چند لمحے ان کے درمیان یونہی باتیں چلتی رہیں۔ تبھی محمود نے کہا؛

''ڈاکٹر صاحب! میں آپ کے پاس آنا نہیں چاہتا تھا لیکن آ گیا ہوں۔ وجہ صرف یہی ہے کہ ماما مطمئن ہو جائیں۔ یہ الگ بات ہے کہ میرے ساتھ کوئی مسئلہ ہے یا نہیں۔ اگر آپ میری ماما سے یہی کہیں گے کہ میرے ساتھ کوئی مسئلہ نہیں ہے میں تندرست ہوں تو اس شرط پر بات آگے بڑھ سکتی ہے۔''

''گھبراؤ مت نوجوان! خدا نہ کرے آپ کے ساتھ کوئی بھی مسئلہ ہو۔ ہاں آپ کی ماما کا اطمینان ضروری ہے، میں وعدہ کرتا ہوں اور اس پر قائم بھی رہوں گا۔''

''اب ٹھیک ہے۔''

"اصل میں ڈاکٹر بات کچھ یوں ہے کہ میں خود نہیں جان پایا کہ میرے ساتھ کوئی مسئلہ ہے یا نہیں۔ میں ایسے میں انہیں کیا بتاؤں۔"

"چلیں، ہم دونوں مل کر کوشش کرتے ہیں۔"

ڈاکٹر شیرازی نے مسکراتے ہوئے کہا تو دونوں میں باتیں شروع ہوگئیں جو بہت دیر تک رہیں۔

چند دن بعد ہی ڈاکٹر شیرازی نے ماما کو مطمئن کردیا کہ ان کا بیٹا تندرست ہے، کسی بھی مسئلے سے دوچار نہیں۔ بہت عرصے بعد وہ اپنی معمول کی زندگی سے ہٹ کر تعلیمی بوجھ سے ہلکا ہوا ہے۔ اس لئے وہ صرف اور صرف وقت کو انجوائے کررہا ہے اور چونکہ انجوائے کرنے کے لئے اس نے اپنے طور پر ایک طریقہ اپنالیا ہے۔ اس لئے تنہائی میں ہی خوشی محسوس کرتا ہے، جیسے ہی اس نے ہاؤس جاب شروع کی۔ وہ نارمل دکھائی دے گا۔ ماما تو مطمئن ہوگئیں مگر محمود برابر ان کے کلینک جاتا رہا اور انہیں ملتا رہا۔ خود ڈاکٹر کو اس کا یہ مسئلہ دلچسپ لگا تھا۔ اس نے نفسیات کی بے شمار کتابوں میں سے ایسا ممکن ہوجانے کے بارے میں پڑھا تھا مگر اس کا عملی ثبوت اس کے سامنے پہلی بار آیا تھا۔ وہ پوری توجہ اور سنجیدگی سے اسے چیلنج سمجھتے ہوئے اس مسئلہ کو حل کرنے کی فکر میں تھا۔

اس دن محمود ایک سنسنی خیز کیفیت کے ساتھ ڈاکٹر شیرازی ان کے پاس گیا۔ ڈاکٹر نے اس دن فائنل رپورٹ دینا تھی۔ جس کا دونوں کو بہت شدت سے انتظار تھا۔ یہ دورانیہ خاصا صبر آزما رہا تھا۔ وہ اطمینان سے بیٹھا تو ڈاکٹر شیرازی نے دھیرے دھیرے کہنا شروع کیا۔

"ہاں تو عزیزم محمود! میری بات ذرا طویل ہوگی، کسی بھی منطقی نتیجے کیلئے میں نے مختلف پہلوؤں سے اس مسئلے کو دیکھا ہے میرا خیال ہے میں وہ بیان کردوں۔"

"میں پوری توجہ سے سن رہا ہوں ڈاکٹر، آپ کہیں!"

اس نے دھڑکتے ہوئے دل سے کہا۔

"تمہارا مسئلہ واقعتاً کسی بیرونی اثر کا نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ سب تمہارے اندر ہی ہے۔ تم اسے اپنا وہم، خیال یا تصور کی پختگی کہہ لو۔،، ڈاکٹر نے محض اتنا کہا اور اپنی

بات کا ردعمل اس کے چہرے پر روشن کرنے کی کوشش کی۔ مگر وہاں سکون تھا، کسی بھی تاثر کا اظہار نہیں تھا۔ تب ڈاکٹر نے کہا: "ایسا کیوں ہوا؟ دراصل یہی سوال بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ اس سوال کو سمجھنے کے لئے ہمیں اس کا پس منظر جاننا بڑا ضروری ہے۔ میں اس پس منظر کو مختصر انداز میں بیان کرتا ہوں۔" ڈاکٹر یہ کہہ کر چند لمحے خاموش ہوا اور پھر کہتا چلا گیا۔ "تمہارے پاپا خالصتاً کاروباری آدمی ہیں۔ اپنی جوانی کا دور انہوں نے بھرپور انداز میں گذارا۔ وہ اپنے حلقے میں ایک پلے بوائے کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے تھے۔ ڈھلتی عمر کے ساتھ اگرچہ انہوں نے یہ سب چھوڑ دیا لیکن جب ان کی شادی تمہاری ماما سے ہوئی تھی تب وہ ان کے عروج کا زمانہ تھا۔ دوسری طرف تمہاری ماما۔! ایک گھریلو قسم کی، صابر وشاکر اور مشرقی روایات کے مطابق زندگی بسر کرنے والی ایک عام سی عورت تھی۔ دونوں کی شادی جن حالات اور وجوہات میں بھی ہوئی ہوگی، اس سے قطع نظر، ان دونوں کے ذہن اور سوچ کا انداز مختلف تھا۔ انہوں نے اپنی عائلی زندگی کسی ذہنی ہم آہنگی کے بغیر شروع کی۔ یعنی تمہارے والدین کے درمیان ذہنی ہم آہنگی نہیں تھی۔ پھر تمہاری پیدائش ہوئی۔ تم وراثتی طور پر "ذہنی عدم ہم آہنگی" لے کر پیدا ہوئے۔ کیا تم یہاں تک میرے ساتھ متفق ہو؟"

"جی ڈاکٹر! میں اتفاق کرتا ہوں۔ نفسیاتی اصولوں سے ہٹ کر بھی جدید سائنس یہ ثابت کررہی ہے۔"

"بدقسمتی سے تم اسی ذہنی عدم ہم آہنگی کے ماحول میں پروان چڑھے۔ تم اکلوتے تھے اور تمہارا کوئی دوسرا بھائی یا بہن نہیں تھی۔ یوں تم تنہا تھے اور تنہائی تمہارے ساتھ ہوگئی۔ تمہارا باپ تمہیں ایک کامیاب کاروباری شخص کے طور پر تربیت دینا چاہتا تھا۔ مگر تمہاری ماما ایک کامیاب ڈاکٹر کے روپ میں دیکھنے کی خواہش مند تھیں۔ کچھ عرصہ تمہارے والدین کے درمیان یہ خاموش جنگ جاری رہی۔ اس جنگ میں تمہارے پاپا کو ہارنا پڑا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ تنہائی جو تمہارے لئے بھی تھی اور تمہاری والدہ کے لئے بھی دونوں نے مل کر اس تنہائی کو ختم کیا۔ لاشعوری طور پر تم اپنی ماما کے خیالات اپناتے چلے گئے۔ جس کا منطقی نتیجہ یہ ہوا کہ شرافت، اچھا پن، عورت ذات کے لئے تقدس بھرے جذبات، بزدلی اور ایک طرح کا کچا پن تمہاری شخصیت کا حصہ بن گیا اور تم ان سب

کاموں سے نفرت کرتے چلے گئے، جو تمہارے پاپا کے تھے۔ ظاہر ہے یہ سب نفرت میں لپٹے ہوئے لفظوں میں بتایا گیا تھا۔ تمہیں بتاؤں کہ انسانی زندگی پر صرف لفظ ہی نہیں لہجے بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہ سب لاشعوری طور پر ہوتا چلا گیا۔ اس کا تمہیں احساس تک نہ ہوا۔ تمہارے پاپا تم سے مایوس ہوگئے اور انہوں نے توجہ چھوڑ دی۔ یہ سب کچھ ساتھ ساتھ چلتا رہا اور اس کے ساتھ تم طبعی طور پر جوانی کی ان حدوں میں آگئے جہاں جذبے اپنا آپ منوانے لگتے ہیں۔ خواہش، ارمان، امید، خوشی اور دکھ کی کیفیات بالکل بدل کر رہ جاتی ہیں۔ جسمانی طور پر یہ تبدیلی تو آئی مگر ایک طاقت جو ماں کی محبت کے روپ میں تھی، تم پر حاوی رہی۔ تمہارا یہ دور ایک کشمکش کا دور تھا۔ باہر کا ماحول تم پر اثر انداز ہوتا اور تمہاری شخصیت کی بناوٹ کچھ اور طرح کی تھی۔ لہٰذا ایسے سارے جذبوں کی راہ میں تم خود رکاوٹ رہے۔ انہیں اپنے اظہار کا رستہ نہیں ملا۔ یہ سب کچھ لاشعور میں رہتا اور تحت الشعور کی پنہائیوں میں گم ہوتا چلا گیا۔'' ڈاکٹر شیرازی یہ کہہ کر تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔ اس دوران وہ محمود کے چہرے پر کسی بھی تاثر کا اظہار تلاش کرتا رہا جو نہیں ملا تو پھر بولا:

''دیکھو میرے عزیز! بھوک کے بعد جنس سب سے بڑی قوت ہے جو انسان کو نہ صرف متحرک کرتی ہے بلکہ جھنجھوڑ کے رکھ دیتی ہے۔ جنسی جبلت جب اظہار کا راستہ نہیں پاتی تو نئے نئے روپ دھار لیتی ہے تم بھی ڈاکٹر ہو اور ادویات کے ضمنی اثرات کے بارے جانتے ہو۔ جیسے سٹیرائیڈ ادویات کینسر کا باعث بنتی ہیں۔ بالکل اسی طرح تمہاری جنسی جبلت نے ضمنی اثرات کی طرح روپ دھارا اور ایک لڑکی کو جو دراصل تمہارا آئیڈل ہے، تمہارے سامنے لا کھڑا کیا۔ یہ سب خیال کی قوت ہے۔ یہاں اس ماحول کو یاد کرنے کی کوشش کرو، جب پہلی بار وہ چہرہ تمہارے تصور میں ابھرا تھا۔''

''ڈاکٹر! یہاں میں آپ سے اتفاق نہیں کرتا۔''

محمود نے اچانک کہا۔

''ہاں بولو۔!''

ڈاکٹر نے تحمل سے کہا۔

''آپ کا اشارہ بلاشبہ شادی والے گھر کے ماحول کی طرف ہے، جہاں پر یہ

چہرہ میرے سامنے آیا۔ میں نے اس وقت پہلی بار عورتوں کو نہیں دیکھا تھا۔ میں جنگل یا ویرانے میں نہیں رہا۔ میری کزنز، میری کلاس فیلوز، میرے اردگرد عورتیں رہی ہیں۔''

''میں مانتا ہوں۔ مگر تب تک تمہارا زاویہ نگاہ مختلف تھا۔ جن عورتوں کا تم نے ذکر کیا ہے۔ سوچ کر بتاؤ۔ کبھی ایک بار بھی جنسی جذبے کے زیر اثر ان کی طرف بڑھے؟'' یہ کہہ کر وہ رک گیا اور جواب طلب نظروں سے محمود کی طرف دیکھنے لگا۔ کوئی جواب نہ پاکر بولا!''میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ تمہارا جواب انکار میں ہوگا۔ میں نے اس ماحول کو یاد کرنے کی بابت اس لئے کہا ہے کہ جب تم نے پہلی بار اپنی ماں کی محبت کی ان دیکھی قید سے فرار کی کوشش کی پھر باغیانہ سوچوں نے جنسی جذبات کے اظہار کا جو راستہ اپنایا وہ تمہارے سامنے ہے۔''

''ڈاکٹر! فرائیڈ کو میں نے بھی کسی حد تک پڑھا ہے۔ اس کے درمیان کچھ اور ماہر جنسیات اور آخر میں ڈاکٹر انون۔ ان کے خیالات اور نظریات میں وقت نے بہت ساری تبدیلیاں کی ہیں۔ میری بحث یہ نہیں کہ وہ کیا کہتے ہیں لیکن اس تناظر میں کہنا میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ نے میری ہسٹری کو محض جنسی اصولوں اور کلیات پر جانچا ہے۔ ایسا کر کے آپ نے محض ایک پہلو کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ میں اگر آپ کی ساری باتیں مان بھی لوں تو ایک بات کا جواب پھر بھی تشنہ لب رہے گا اور وہ یہ کہ جس چہرے کو میں نے ایک رات پہلے دیکھا، مان لیا کہ خیالوں میں ہی سہی لیکن اگلے دن وہی چہرہ مجسم حالت میں میرے سامنے تھا۔''

''یہ مخصوص اتفاق ہوسکتا ہے۔''

''آپ کے منطقی نتیجہ کے پس منظر میں اگر میں یہ بھی جان لوں تو میں جتنی کشش اور محبت اس چہرے کے ساتھ محسوس کرتا، اس مجسم وجود کے ساتھ ذرا سا بھی نہیں کر پایا۔ سوال یہ ہے کہ میری جنسی جبلت نے اس کی طرف کشش محسوس نہیں کی۔ ہاں یہ بات قرین قیاس ہوسکتی ہے کہ چہرے سے مماثلت کے باعث وہ قریب قریب یا آشنا محسوس ہوسکتی ہے۔''

''ہوسکتا ہے تمہارے سامنے کچھ رکاوٹیں آگئی ہوں؟ تم اپنے اس چہرے میں کشش یا محبت اس لئے محسوس کررہے ہو کہ وہ تمہاری دسترس میں ہے اور مجسم وجود

دسترس میں نہیں۔اسے نرگیت کہتے ہیں ؟''

''نہیں! حقیقت یہ ہے کہ اگر میں وہی کشش ،وہی محبت جو چہرے سے محسوس کرتا ہوں۔اس سے کہیں کم اس مجسم وجود سے کرتا تو وہ اب تک میرے پہلو میں ہوتی۔ میں اپنی راہ کی رکاوٹیں دور کرنا جانتا ہوں۔ جہاں تک جنسی جبلت کے اظہار میں رکاوٹ کی بات ہے تو میرے پاس ایسے مواقع تھے جس سے میں فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ بہت ساری لڑکیاں میری طرف بڑھیں تھیں۔ اصل میں میری جنسی جبلت نے مجھے زیر نہیں کیا اور نہ ہی اپنا آپ میرے سامنے منوایا ہے اگر وہ مجھے پریشان کرتی تو میرے پاس تسکین کے کافی ذرائع تھے اور پھر ڈاکٹر۔ ! عورت کے ذکر کے ساتھ ہی ہم اسے ایک جنسی سمبل کیوں سمجھ لیتے ہیں۔ اگر چہرہ کی صورت لڑکی کی بجائے کچھ اور ہوتی تو......؟ یہ محض جنسی جبلت نہیں ڈاکٹر کچھ اور ہے۔''

محمود نے پوری شدت سے کہا تو ڈاکٹر نے ایک بار چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ پھر دھیرے سے بولا؛

'' دیکھو بیٹا تم انکار کرسکتے ہو، بالکل اس طرح جیسے روشن دن میں سورج کے وجود سے انکار کردیا جائے۔ اصل میں تم خود اس تصور سے دستبرداری نہیں چاہتے۔ اگر تم اس تصور کو ختم کردینے پر آمادگی ظاہر کرو تو اس کا علاج ممکن ہے...... اور میں نے تمہارا علاج ''شادی'' تجویز کیا ہے۔تمہاری جنسی جبلت کی تسکین ہی تمہارا علاج ہے۔''

محمود یہ سن کر دھیرے سے مسکرایا اور پھر بڑے ہی نرم لہجے میں بولا؛

'' ڈاکٹر! کیا آپ جنسی جبلت اور محبت میں فرق محسوس کرسکتے ہیں ؟''

'' بالکل کیوں نہیں۔،،

ڈاکٹر نے بے ساختہ کہا۔

''فرق ہے؟'' اس نے تصدیق طلب انداز میں کہا اور پھر بولا؛ ''تو آپ میرے لئے ایسا کیوں کہہ رہے ہیں۔ آپ چہرے کے وجود کو محبت کی نگاہ سے کیوں نہیں دیکھتے۔''

''میں اگر تمہاری یہ بات بھی مان لوں تو وہ چہرہ مجسم وجود نہیں محض ایک واہمہ ہے، جیسے پانی پر عکس ، یہ محبت نہیں دیوانگی کی شروعات ہیں۔واہموں سے محبت دیوانگی ہی

تو ہے۔ جب تم یہ مان لوگے کہ تمہارا وجود مجسم حقیقت ہے اور وہ چہرہ محض واہمہ ،تو ہی، تمہیں سمجھ آنا شروع ہوگی۔ وہ چہرہ تمہارے دھیان سے تبھی اترے گا جب تم شادی کرلو گے اور پھر وہ چہرہ ایک خوبصورت یاد کے سوا کچھ بھی نہیں رہے گا۔''

'' ڈاکٹر! وہ چہرہ شادی کے بعد بھی میرے ساتھ رہا تب ؟''

اچانک محمود نے کہا تو ڈاکٹر نے غور سے اسے دیکھا اور زیرلب مسکراتے ہوئے بولا ؛

'' تو پھر یہ ایک مختلف نوعیت کی بیماری ہوگی۔ اس کا حل کسی اورطرح سے ممکن ہوگا۔ لیکن مجھے نہیں یقین یہ دوبارہ تمہارے ساتھ رہے۔اس کے لئے تمہارے اندر آمادگی چاہیے۔''

یہ کہہ کر ڈاکٹر شیرازی خاموش ہوگئے،ان دونوں کے درمیان کتنے لمحوں تک خاموشی ٹھہری رہی۔تبھی محمود نے کہا؛

''تو یہ ہے ڈاکٹر ، آپ کی حتمی رپورٹ......؟''

''بالکل ،تم جلد از جلد شادی کرکے اس بیماری سے نجات پاسکتے ہو۔''

''لیکن میں آپ سے متفق نہیں ہوں۔''

یہ کہا اور پھر پوری سنجیدگی سے بولا '' میں اسے بیماری سمجھتا ہی نہیں کیونکہ بیماری انسان کو پژمردہ کردیتی ہے۔ انسانی جسم سے رس نچوڑ لیتی ہے۔مگر! میرا چہرہ مجھے توانائی دیتا ہے۔میرا حوصلہ ہے وہ۔ میرا انگ انگ خوشی سے بھر جاتا ہے۔ میرا من مہک اٹھتا ہے۔ آپ نے میرے مسئلے کو محض جسمانی تناظر میں دیکھا ہے۔ کیا آپ روح کے قائل نہیں ہیں؟ روح! جسم کی بے اعتدالیوں سے بیمار پڑتی ہے جبکہ روح ہمیشہ جسم کو توانائی دیتی ہے۔جنس تو حیوانیت کی طرف لے جاتی ہے۔ میں یہ مانتا ہوں کہ جنس ایک طاقت ہے، ہوگی، لیکن ان کے لئے جو اسے طاقت مان کر اس کے زیر اثر ہو جاتے ہیں۔ میں یہ بھی مانتا ہوں کہ جنسی گھٹن خطرناک نتائج پیدا کرتی ہے ،کرتی ہوگی، مگر ان کے لئے جو جنسی عفریب کے سامنے خود کو بے بس پاتے ہیں۔میں پوچھتا ہوں جنس ہے کہاں؟ کسی شے میں یا خود اپنے دماغ میں ،جنسی دباؤ جسم پر جو عتاب لائے مجھے اس سے انکار نہیں مگر جنسی دباؤ! روح کو آلودہ کرتا ہے۔تب پھر فرحت ، تازگی یا خوشی، انسانی

روپوں سے خارج ہوجاتی ہے۔ ہاں تسکین اگر ملے گی تو وہ روحانی نہیں حیوانی تسکین ہو
گی۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ جب روح، انسانی جسم کو توتیں دیتی ہے تو وہاں جنسی جبلتوں کی
سپردگی نہیں ہوتی، ضبط نفس اور جنسی گھٹن میں فرق ہے اور یہ محبت کے اجزائے ترکیبی کا
محض ادنٰی سا جزو ہے، کل نہیں، اس معمولی سے فرق کو اگر سمجھیں تو...... خیر! میں اسے
اپنے طور پر سمجھنے کی کوشش کروں گا۔ آپ کا شکریہ ڈاکٹر۔"

محمود نے کہا اور وہاں سے اٹھ آیا۔

اس رات وہ اپنے لان میں تنہا بیٹھا تھا۔ اپنے اردگرد کے ماحول سے بے خبر
محض اپنی اندرونی کیفیات پر توجہ دیئے مسلسل سوچتا چلا جارہا تھا۔ اس کی سوچوں کا محور
ڈاکٹر شیرازی کی تحقیق اور منطقی نتیجہ تھا، جسے اس نے ذرا سا بھی متاثر نہیں کیا تھا وہ ڈاکٹر
اپنے طور پر صحیح تھا کہ اس نے مسئلے کی بنیادیں جن اصولوں پر رکھیں تھیں، عمارت بھی ویسی
ہی بنی۔ اس نے سطحی اصولوں کو اپنایا جس کا لازمی نتیجہ سطحی ہی ہونا چاہیے تھا۔ کیفیات تو
غیر مادی ہوتی ہیں۔ وہ تو مادہ پر اثرانداز ہوسکتی ہیں لیکن مادہ تو غیر مادی تصورات پر
حاوی نہیں ہوسکتا۔ یہ سوال تو بہت بعد کا ہے کہ چہرہ اس کے لئے فائدہ مند ہے یا نہیں؟
لیکن اس سے پہلے اسے یہ یقین ہونا چاہیے کہ چہرہ اس کے کوئی مسئلہ ہے یا نہیں؟ خودرو
بیل کا یہ تجزیہ کرنا کہ آیا یہ بیل انسانی زندگی کے لئے مفید ہے یا نہیں بعد کی بات ہے
پہلے تو سوچنا چاہیے کہ یہ اپنے آپ اگ جانے والی بیل آخر پھوٹی کیسے؟ کہیں تو اس کا
بیج ہوگا؟ زمین اس بیج کے لئے موافق ہوگی؟ بیج پھوٹنے سے کونپل تک کا سفر، موسم کی
سازگاری کا عمل دخل؟ نہ بنا بیج کے کونپل پھوٹتی ہے اور نہ بنجر زمین بیج اگانے کی صلاحیت
رکھتی ہے۔ یہ ایک عمل ہے، فطری عمل! مجھے ان وجوہات تک پہنچنا ہے، انہیں جاننا ہے،
سمجھنا ہے، چہرہ، میرا من، میرے حالات! ایک تکون ہیں، فی الوقت پراسرار تکون، یہ تکون
کیسے وجود میں آئی۔ اس کی جڑیں ابھی اندھیرے کے سمندر میں پوشیدہ ہیں۔ کیا مجھے خود
ہی اندھیروں میں اترنا ہوگا؟ جہاں نہ کوئی نشان منزل دکھائی دیتا ہے اور نہ راہوں کا پتہ
ملتا ہے۔ اندھیروں میں اترنے سے تو انسان بھٹک جاتا ہے...... کہیں کا نہیں رہتا...... وہ
مسلسل سوچتا چلا جارہا تھا۔ تبھی اس کے اندر سے آواز ابھری۔ "من کے اندھیرے
میں اگر مثبت سوچ کی ہلکی سی کرن بھی نمودار ہوجائے تو سارے مناظر واضح ہونا شروع

ہوجاتے ہیں۔ چہرہ! ایک روشن حقیقت کی طرح تمہارے سامنے واضح ہے۔ اب یہ منزل
ہے یا نشان منزل، رستہ ہے یا محض سنگ میل، جو بھی ہے، جب یہ اندھیروں سے نکل کر
تمہارے سامنے آسکتا ہے تو سمندر میں پوشیدہ جڑیں بھی تمہاری ہتھیلی پر آجائیں گی۔ بس
صبر سے، تحمل سے جستجو میں لگے رہو۔"

اس نے اپنے اندر سے اٹھنے والی اس آواز پر توجہ دی تو خودکلامی کا ایک سلسلہ
چل پڑا۔ وہ کہنے لگا؛

"ہاں! مجھے لذت آشنا ہونا چاہیے، مجھے سوچ کے دائروں میں پھنس کر چہرے
کی حقیقت کو گم نہیں کرنا اور پھر...... چہرہ میرے لئے، میری ذات کے لئے، میرے وجود
کے لئے نقصان کا باعث تو نہیں ہے بلکہ مجھے پر اعتماد کرتا ہے، میرا حوصلہ بڑھاتا ہے، میں
انتظار کروں گا، مجھے انتظار کرنا چاہیے۔ پوری توجہ سے جستجو کرنی چاہیے۔ ایسا کروں گا تو
حقیقت میرے سامنے روشن ہوجائے گی۔"

اس نے بڑبڑاتے ہوئے طمانیت سے پہلو بدلا، سکون سے ٹیک لگائی اور
دھیرے سے بند آنکھیں کھول دیں۔ تبھی وہ چونک گیا۔ چہرہ اپنی پوری جولانیوں کے
ساتھ اس کے سامنے موجود تھا۔ وہ اسے دیکھتا رہ گیا۔ وہ بڑے سکون سے اس کے سامنے
والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ رات کی تاریکی کو برقی قمقموں نے اگرچہ نیم تاریک کردینے کی
بھرپور کوشش کی تھی اور اس نیم تاریکی میں وہ ہیولا سا لگ رہی تھی تاہم چہرہ اپنے وجود
میں روشن تھا۔ اس کے اردگرد ایک مخصوص روشنی کا ہالا تھا۔ جب اس نے چہرہ کی آنکھوں
میں جھانکا تو اس کی آنکھوں سے جھلکتی سرمستی اسے واضح دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے
گال یوں سرخ تھے جیسے سخت سردی میں، یا دھوپ کی تمازت سے خون چھلک اٹھتا ہے۔
ہلکے ہلکے لرزتے ہوئے رس بھرے ہونٹوں پر کچے جذبوں کے پھول کھلے ہوئے تھے۔
سفید گردن پر پھیلے ہوئے سیاہ بال اور ان میں سے جھانکتے جھمکے، چہرہ ایسے احساس کی
خوشبو دے رہی تھا جس میں خوشی کا نشہ ہوتا ہے۔ وہ پہلے ہمیشہ ایک سے لباس میں اس
کے سامنے آتی رہی تھی مگر اس وقت وہ ایک نئے طرح کے لباس میں تھی۔ سیاہ ریشمی
شلوار قمیض پر سنہری زری کے کام والا لباس پہنے ہوئے تھی جس میں جڑے نگینے اپنی بساط
پر دھنک رنگوں سے نواز رہے تھے۔ ایک لمحہ کے لئے محمود کو اپنے حواس گم ہوتے ہوئے

دکھائی دیتے لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔شاید وہ مقام حیرت سے ایک پل میں ہی نکل آیا تھا۔

وہ پوری توجہ سے محمود کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔سارا ماحول مسرور ہوگیا۔ رعب حسن، رعنائی، تمکنت نکھار ،اس حوالے سے جتنے بھی لفظ تھے اپنے معنی کے ساتھ اس پر آشکار ہوتے چلے گئے۔جذبات اور کیفیات کا ایک بہاؤ تھا جو من سے پھوٹا اور آبشار کی طرح گنگناتا ہوا اسے سرشار کرتا چلا جا رہا تھا۔تبھی وہ خاموشی کے مفہوم کو سمجھ گیا۔

''آج بہت خوش ہوں میں۔ ! ''

چہرہ نے خاموشی کے طلسم کو توڑ دیا۔

''خوش ہو۔ ! مگر کیوں ؟''

سوال میں تجسس سے زیادہ اپنائیت کی ملاوٹ تھی۔اس نے اپنی گھنیری پلکیں اٹھائیں اور مسرور کردینے والی ادا سے دیکھتے ہوئے بولی:

''ہاں ،بہت خوش! آج تم نے مجھ سے بچھڑ جانے کی کوشش ناکام بنادی ہے۔ مجھے تم پر زیادہ اعتماد ہوگیا ہے۔''

''کیا پہلے نہیں تھا ؟''

اس نے بے چینی سے پوچھا۔

''تھا ،کیوں نہیں تھا۔ میرا یہاں ہونا ہی اس اعتماد کا ثبوت ہے۔ ہوتا ہے نا کہ جب مبہم سی امید پختہ حقیقت میں تبدیل ہوجائے۔ بالکل ایسے جیسے پانی پر عکس کو اٹھا کر ہم اپنے کمرے کی دیوار پر آویزاں کرلیں۔''

اس کے لہجے میں کسی معبد میں عبادت کرنے والی کی دعائیہ لذت تھی۔محمود پورے وجود سے سرشار ہوگیا۔اسی کیفیت میں اس نے پوچھا؛

''تم کیوں آتی ہو میرے پاس ؟''

سوال ،سمندر میں پوشیدہ جڑیں تلاش کرنے کی جستجو سے رنگا ہوا تھا۔چہرہ ہلکے سے مسکرا دیا اور نرم لہجے میں بولا؛

'' میں لاکھ وضاحتیں کر بھی دوں تب شاید میں پھر بھی کچھ نہ کہہ سکوں گی۔ ہاں!

تم اپنے اطمینان کے لئے کوئی جواب ہی چاہتے ہو تو میری جاں اپنے دل میں جھانک لو وہاں خوشبو دیتا ہوا جواب پوری طرح محفوظ ہے۔''

''تم......جواب...... اور میرا دل...... ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔''

وہ منطق کی الجھنوں میں پھنس گیا تو چہرہ دھیرے سے ہنس دیا جیسے کوئی معصوم بچے کی خواہش پر ہنستا ہے۔ پھر وہ بولی؛

''یہ محبت بھی بڑی نرالی شے ہے۔اسے سمجھا نہیں جاتا ،بس محسوس کیا جاتا ہے اور تمہیں پتہ ہے محسوسات کی یہ دنیا کیسے وجود میں آتی ہے ؟ جب رابطہ ہوجائے۔ دو طرفہ رابطہ ہی زندگی کی اس حقیقت سے آشنائی دیتا ہے اور...... اور...... یہ محبت کا فلسفہ بھی عجیب فلسفہ ہے...... کہیں اظہار پر پابندی اور کہیں کہہ دینے کی مجبوری ،یہ محبت اپنی سزا خود ہی ہے اور جزا بھی ،مگر دونوں صورتوں میں خوبصورت ہے لیکن جانو! تم یہ جان لو جب تک ہم دوسروں کے من میں اپنی جگہ نہیں بناسکتے تب تک ہمیں محبت کرنے کا کوئی حق نہیں۔تم محبت کو جس طرح پہچانو گے یہ تمہیں اسی بھیس میں ملے گی'غیر مرئی قوت میں یا ٹھوس مادیت میں۔یہ سارے ہنر خود سکھاتی ہے ،کسی کی ادا سے مطلب اخذ کرلینے سے لے کر خیال آرائی تک،مرنے سے پہلے مر جانے سے لے کر زندہ ہوجانے تک...... جیسے چاند کی فطرت ہے چاندنی دینا۔اب کوئی چاندنی کو قید نہیں کرسکتا ،نہ اس پر ملکیت جتا سکتا ہے...... ہاں...... اس سے لطف اندوز ہوسکتا ہے...... اور سنو! محبت وہ قوت ہے جو تصور کو حقیقت میں تبدیل کرسکتی ہے۔یہ ایک عام سی بات ہے ،لیکن پختگی کی منزل تک پہنچتے ہوئے ایسے مقام بھی آتے ہیں جب تصور سے حقیقت کو جدا کرلیا جاسکتا ہے اور دونوں اپنی جگہ قائم ودائم رہتے ہیں ،کیا تم جانتے ہو انسان کی حقیقت کس میں ہے؟ اس کی روحانی اور مادی زندگی...... اس کے ظاہری عمل، اس کی بھرپور باتیں اس کے رویئے...... یہ انسان کی بھرپور اور مکمل تصویر نہیں، اس میں رنگ انہی عوامل،باتوں اور رویوں سے ہیں جو ابھی وجود میں نہیں آسکے مگر اپنا اظہار کرنے کیلئے تڑپ رہے ہیں۔ خیر! مجھے نہیں معلوم کہ میں تم سے کتنی محبت کرتی ہوں کیونکہ چاند کی چاندنی، پھول کی خوشبو اور سمندر کے پانیوں کو نہ تولا جاسکتا ہے نہ ماپا جاسکتا ہے،محبت تو ان سے بھی ماورا ہے۔کیا تم تصور کی وسعت اور گہرائی کو ناپ سکتے ہو؟ میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ میں تم

سے محبت کرتی ہوں اور میرے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ میں تم سے محبت کر رہی ہوں۔"

"تم...... چہرہ تم...... مجھ سے محبت کیوں کرتی ہو؟"

محمود ابھی تک توجہات کی زنجیروں میں قید تھا۔ چہرے کا قہقہہ فضا میں بکھر گیا۔

وہ جوت جگاتی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بولی:

"سورج کیوں نکلتا ہے؟ چاند اپنی چاندنی کیوں پھیلا دیتا ہے؟ ہوائیں کیوں ہر دم سفر میں رہتی ہیں، پھول اپنی خوشبو سے کیوں ماحول مہکا دیتا ہے۔ اگر ان سوالوں کا جواب ہے تمہارے پاس تو وہی جواب میرا ہے۔"

"جن مظاہر کی تم نے بات کی ہے، ان سب کی ایک وجہ ہے، تمہاری محبت کی بھی تو کوئی وجہ ہوگی ایسا اس لئے پوچھ رہا ہوں تم ایک الگ قسم کی حقیقت ہو۔"

"میں نے کہا نا محبت سارے ہنر سکھا دیتی ہے۔ تم اپنے من کی سیاحت کے لئے سفر کی ابتدا تو کرو۔ تمہیں احساس ہی نہیں کہ کتنی منزلیں تمہارے قدم چومنے کی منتظر ہیں۔ سفر شرط ہے میری جاں...... ایک نقطہ سے لے کر کائنات کی وسعتیں ہیں تمہارے اندر، تم ابھی ساحل پر کھڑے سمندر کی خاموشیاں دیکھ رہے ہو، گوہر نایاب تو تہوں میں ملا کرتے ہیں...... سوال مت کرو، کیونکہ سوالی اکثر دھتکار دیئے جاتے ہیں۔ بس اپنا سفر شروع کرو، تم پر سب کچھ روشن ہو جائے گا۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو!"

محمود ایک دم سے مان گیا۔

"اب میں چلوں۔"

وہ اچانک اٹھ گئی۔

محمود نے اسے روکنے کے لئے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ چہرہ چند لمحوں میں معدوم ہو گا۔ تب ماحول ہی بدل گیا۔ وہ لان کا تاریک گوشہ حبس سے بھر گیا، فضا میں دھویں کی آلودگی در آئی۔ ویرانی کا احساس شدید ہو گیا۔ وہ اُوب گیا تو اٹھا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

سردیوں کی وہ شام خنکی میں لپٹی ہوئی تھی۔

ڈھلتے دن کے ساتھ سورج اپنی تمازت کھو رہا تھا اور اس کی رنگت پگھلے ہوئے سونے کی طرح ہو رہی تھی۔ زرد دھوپ، پارک میں موجود گہرے سبز اور اُڑی اُڑی رنگت والے پودوں، پژمردہ سی گھاس اور خزاں رسیدہ پتوں والے درختوں پر پڑی ہانپ رہی تھی۔ پوربی ہوا لمحہ لمحہ خنکی کا احساس بڑھا رہی تھی۔ ایسے میں صوفیہ اور نادیہ سرخ اینٹوں سے بنی روش پر آہستہ قدموں سے چلتی چلی آ رہی تھیں۔ دونوں نے ایک جیسی سرمئی رنگ کی شلوار قمیض پہنے ہوئے تھے۔ کاندھوں پر موتیا رنگ کی شالیں اور پیروں میں جوگر پہنے وہ سب سے بے نیاز تھیں۔ خشک پتے ان کے پیروں تلے آ کر چرمرا رہے تھے، وہ دونوں خاموش تھیں اور خاموشی کا یہ دورانیہ طویل ہوتا چلا جا رہا تھا۔ تبھی ان کے پاس سے ایک بچہ پتنگ اڑاتا ہوا گزر گیا۔ اس کی ساری توجہ اس پتنگ کی طرف تھی جس کی لمبی سی دم ہوا میں لہرا رہی تھی۔ ان کے درمیان اونگھتے ہوئے ماحول نے انگڑائی لی تو صوفیہ نے سکوت توڑا:

"میں کل پیپر دینے محمود کے شہر جا رہی ہوں، سحرش کے ہاں ٹھہروں گی۔"

اس نے یوں کہا جیسے خود کلامی کر رہی ہو۔ یہی بات وہ اب تک کئی بار کہہ چکی تھی۔ ہر بار نادیہ خاموش رہتی۔ اسے بھی معلوم تھا کہ اسے لیکچرار بننے کے لئے ٹیسٹ دینے محمود کے شہر جانا ہے اور پھر شاید کامیابی کی صورت میں انٹرویو کے لئے بھی جانا پڑے۔ ان کے درمیان اس شام لیکچررشپ، ٹیسٹ اور انٹرویو سب بے کشش موضوع ہونے کے باعث پس منظر میں چلے گئے تھے۔ دھیان میں صرف اور صرف محمود کے شہر

جانے کی کشش تھی۔نادیہ کو احساس تھا کہ صوفیہ کیا کہنا چاہتی ہے مگر وہ خود اسے پورے ذات کے ساتھ سننا چاہ رہی تھی۔صوفیہ کا محض چند لفظ کہہ کر خاموش ہوجانا ہی اس کی ذات میں تبدیلی کی کروٹیں ظاہر کرر ہا تھا۔اس ایک اطلاع میں کتنی خوش کن امیدیں، کتنے رنگین خواب اور کتنی مچلتی ہوئی خواہشیں پنہاں تھیں؟ صوفیہ کے من میں پھیلے سمندر میں یہ کیسا جوار بھاٹا ہے، اس بارے وہ خود متجسس تھی۔صوفیہ کی ذات میں تبدیلی کی نشانیاں کیوں اور کیسے؟ ان سوالوں کے جواب وہ خود بھی چاہ رہی تھی۔اسی خاموشی میں وہ چند قدم اور آگے بڑھ گئیں ، کچھ اور خزاں رسیدہ پتے ان کے پیروں تلے کچلے گئے۔ پھر وہ دونوں اسی خاموشی میں لپٹی ہوئیں ایک سنگی بینچ پر جابیٹھیں۔صوفیہ نے نیم وا آنکھوں سے سورج کی طرف دیکھا اور بولی؛

’’نادیہ یار! مشورہ دو ، مجھے محمود سے ملنا چاہیے یا نہیں؟‘‘

نادیہ برف ٹوٹنے پر مسکرادی۔کہنے کے لئے اس کے پاس بہت کچھ تھا۔وہ گیند اس کی کورٹ میں پھینک کر کہہ سکتی تھی کہ تم اپنے من کی کہو ، وہ کیا چاہتا ہے؟ دل میں کیسی طلب ہے؟ کہ یہ دل ہی تو ہے جو سارے وجود پر حکمرانی کرتا ہے لیکن ایسے وقت میں جبکہ اس کی دوست بکھری بکھری سی تھی ، وہ بڑی شدت کے ساتھ اسے سمیٹ لینا چاہتی تھی۔ اس نے چند لمحے سوچا اور کہا؛

’’تم اسے ملنے جاؤ یا وہ تمہیں ملنے کے لئے آئے ، بحث اس سے نہیں۔اصل بات یہ ہے کہ تم دونوں کی ملاقات میں انا حائل رہی تو یہ ملنا بے مقصد ہوگا۔تم اگر اس ملاقات کو بامقصد بنانا چاہتی ہو تو انا کو درمیان میں سے ہٹانا ہوگا۔‘‘

’’دوسرے لفظوں میں تمہارا مطلب یہ ہوا کہ مجھے اس سے ملنا چاہیے؟‘‘

صوفیہ نے اپنے من کی بات کہہ دی۔

’’اگر تم بہتر سمجھتی ہو اور اس کا رویہ دیکھنا چاہتی ہو تب! تم اس کے شہر جاؤ گی، اسے معلوم ہوگا تو اس کا ردعمل سامنے آئے گا۔ اور صوفیہ! یہی ردعمل اس کے اندرونی جذبوں کا اظہار ہوگا۔بالکل اسی طرح جیسے اس نے سیب کا ذائقہ تک چکھنا ختم کردیا تھا۔‘‘

’’مگر ایک خوف سا لاحق ہے مجھے، کہیں..... کہیں اس کا ردعمل ویسا نہ ہو جسے

میں سوچتے ہوئے بھی گھبراتی ہوں۔‘‘

وہ جھرجھراتے ہوئے لہجے میں بولی۔

’’تمہیں ہمت کرنا ہوگی۔‘‘

نادیہ نے تیزی سے حتمی لہجے میں کہا تو صوفیہ نے سر جھکالیا۔چند لمحوں بعد اس نے مسکراتے ہوئے کہا؛

’’میں اس سے ملوں گی۔‘‘

’’ہاں! تم اسے ملنا ، پھر تمہارے ساتھ اس کا جو بھی رویہ ہوگا ، وہی تمہاری ذات سے اس کی دلچسپی کا پتہ دے گا۔قبل از وقت کچھ بھی کہنا یا سوچنا بے کار ہوگا۔‘‘

وہ سمجھاتے ہوئے بولی۔

’’تم ٹھیک کہتی ہو۔‘‘ اس نے پرسکون لہجے میں کہا اور سنگی بینچ سے ٹیک لگالی۔ وہ کتنی دیر تک اپنے خیالوں میں کھوئی رہی جیسے کسی حتمی فیصلے پر پہنچ جانے کے بعد اگلا لائحہ عمل سوچ رہی ہو۔پھر اچانک اٹھتے ہوئے بولی’’ آؤ ، واپس چلیں ، مجھے صبح سفر پر جانے کے لئے تیاری بھی کرنا ہے۔‘‘ وہ دونوں چل دیں۔نادیہ نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے محسوس کیا کہ صوفیہ کے قدم تیزی سے اٹھ رہے ہیں۔

☆☆☆

فون کی تیز گھنٹی نے گھر کے پرسکون ماحول کو الجھا کر رکھ دیا، جیسے ساکت جھیل میں کنکر مار دیا جائے۔ شاید فون کے قریب کوئی نہیں تھا، اس لئے محمود کو خود ہی اٹھنا پڑا، اس نے ریسیور کان کے قریب لے جا کر بے خیالی سے کہا؛

''جی فرمائیے!''

''اجی ہم کیا فرما سکتے ہیں، ہم تو بس عرض ہی کر سکتے ہیں۔''

دوسری طرف سے سحرش کی زندگی سے بھرپور آواز اس کے کانوں میں رس گھول گئی۔ اس کے ساتھ ہی تنا ہوا ماحول نرم ہوگیا۔

''اوہو...... تو یہ آپ ہیں، میں بھی کہوں فون اپنے معمول سے زیادہ آواز میں کیوں بج رہا ہے۔ خیر! زہے نصیب، ہمیں یاد کیا آپ نے......'' وہ بھی شوخی پر اتر آیا۔

''ارے ڈاکٹر صاحب! ہم تو آپ کو ایسے اکثر یاد کرتے ہی رہتے ہیں لیکن آپ گھر پر نہیں ملتے، آج چونکہ ہم نے یاد نہیں کیا سو آپ گھر پر ہی مل گئے۔''

سحرش کا لہجہ ہنوز شوخ اور زندگی سے بھرپور تھا۔

''ارے واہ سحرش، یہ تو کمال ہوگیا۔ ہمیں کسی اور نے بھی یاد کر لیا۔ کون ہے وہ خوش بخت جو ہم سے ہمکلامی چاہتا ہے۔''

''ہم مان گئے کہ اسے نصیب کہتے ہیں۔ ہم اگر آپ سے بات کرنا چاہیں تو آپ ندارد، مگر ہمارے ہاں آئی ہوئی مہمان نے آپ کو یاد کیا تو......''

''چلو بابا مان لیا...... ٹھیک ہے۔ اب آگے کہو۔''

''اجی ہم نے کیا کہنا ہے جو بھی کہنا ہے محترمہ صوفیہ ہی کہیں گی۔ آپ لیکچرار کا

ٹیسٹ دینے آج ہی یہاں آئی ہیں۔ کل ٹیسٹ ہے...... لیں بات کر لیں۔''

سحرش نے تیزی سے کہا اور پھر چند لمحوں بعد ہی ریسیور میں صوفیہ کی آواز ابھری۔ رسمی کلمات، حال احوال اور آمد کے متعلق باتوں کے بعد اس نے کہا؛

''کل آپ پہلے وقت سکون سے امتحان دے لیں، دوسرے وقت آپ ہمارے ہاں ضرور آیئے گا، میں بھی ہسپتال سے واپس آ جاؤں گا۔ میں اور سحرش پروگرام بنا لیتے ہیں۔ پلیز ذرا فون اسے دیجیے گا۔'' کچھ لمحوں بعد سحرش کی آواز ابھری تو اس نے کہا ''سحرش وہ صوفیہ یہاں ٹسٹ دینے آئی ہے، اسے پڑھنے دینا اور زیادہ گپیں نہیں لگانا، کل جب وہ ٹسٹ دے کر واپس آ جائے تو مجھے فون کر دینا۔ میں آپ لوگوں کو پک کر لوں گا۔ یا پھر جو بھی پروگرام بنے وہ مجھے بتا دینا، میں تمہارے فون کا انتظار کروں گا۔ ٹھیک ہے نا......؟''

''جی بالکل ٹھیک ہے۔'' سحرش نے کہا تو محمود نے الوداعی کلمات کہہ کر فون بند کر دیا، ریسیور رکھ کر پلٹا تو ماما خاموش کھڑی تھیں۔ انہوں نے پوچھا؛

''کس کا فون تھا؟''

''سحرش کا، صوفیہ آئی ہے ان کے گھر، میں نے انہیں یہاں آنے کی دعوت دی ہے۔''

''بہت اچھا کیا بیٹا! میں خود اس سے ملنا چاہوں گی۔ تم نہ کہتے تو بھی میں اسے بلا لیتی، خیر! کل تم اسے بہت اچھا ٹریٹ کرنا۔''

''جی ماما! یہ میرا اخلاقی فرض ہے اور میں چاہوں گا کہ وہ ہمارے ہاں سے بہت ہی اچھا تاثر لے کر جائے۔''

یہ کہہ کر وہ اپنے بیڈ روم میں چلا گیا۔

وہ سکون سے لیٹ گیا تو صوفیہ کا خیال اس کے ذہن میں در آیا۔ پہلی سوچ ہی یہی ابھری کہ چہرہ اور صوفیہ میں کس قدر مشابہت ہے۔ چہرہ کو محض ایک واہمہ گردانا جا رہا ہے اور وہ ایک ٹھوس حقیقی وجود، اگر وہ اس کے سامنے نہ آتی تو محمود کا پریشان ہو جانا لازمی تھا۔ وہ چہرہ کی تلاش میں بے سکون ہو کر بھٹکتا رہتا۔ بھی ہنستے بستے شہر اور لوگوں کا ہجوم اس کے لئے سراب بھرے صحرا اور پراسرار وادیوں میں بدل کر رہ جاتا۔ ایک خیال

ہے اور دوسرا وجود، کس قدر تضاد ہے ان دونوں میں اور شاید لگاؤ بھی۔اس کی سوچ نے کروٹ بدلی تو سوچوں کا ایک سلسلہ طویل ہوگیا۔صوفیہ کے وجود میں اس کے لئے ذرا سی بھی کشش نہیں تھی ،جبکہ چہرہ اس کے من میں جولانیاں بھر دیتا تھا۔"ایسا کیوں ہے؟"

یہ سوال دراز ہوتا گیا،بے شمار دلیلیں اور توجہات اس پر اپنا آپ وارتی چلی گئیں۔نتیجہ یہی نکلا کہ صوفیہ خودغرضانہ تفاخر کے حصار میں قید ہے،جس کا اظہار اس کی آنکھوں اور چہرے سے ہوتا ہے۔ اس کا رویہ تو بعد کی بات ہے۔ جبکہ چہرہ اپنی تمام تر رعنائیاں اس پر لٹا دینے کو تیار رہتا ہے۔

"کیا فقط رعنائیوں کے لئے وہ چہرہ میں کشش محسوس کرتا ہے؟"

یہ ایک ایسا سوال تھا جس نے اس کے پورے وجود کو ہلا کر رکھ دیا۔وہ بے چینی سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور پھر بیڈ کے سرہانے ٹیک لگالی۔اس نے پوری سچائی سے اپنے من میں جھانک کر دیکھا تو وہاں اپنائیت کے معیار ہی کچھ اور تھے جن کی بنیاد عدل پر ہوتی ہے۔ اسے معلوم تھا کہ انصاف اور عدل میں فرق ہوتا ہے۔اسی لئے اسے معیارِ اپنائیت کی تلاش میں سرگرداں نہیں ہونا پڑا۔ایسا اسی وقت ہوتا ہے جب وجدان جیسی نعمت میسر آجائے۔ یہ ہر کسی کے بس میں نہیں ہوتا۔سچائی سے کیے گئے تجزیئے کے بعد اس کا من شانت ہوگیا۔ چند لمحے پہلے جو اس کے وجود میں صحرا اتر آیا تھا اور جس کے بگولوں نے اسے پریشان کرکے رکھ دیا تھا۔اب وہاں گھنی چھاؤں کی لطافتیں دیتا گہرا سبز نخلستان تھا۔

اگلے دن وہ ہسپتال سے نکلا تو اسے یاد آیا۔سحرش نے اسے فون کرنا تھا۔گھر کی طرف واپسی پر وہ کار ڈرائیو کرتے ہوئے سوچتا رہا کہ آخر ہوا کیا؟ پھر اپنے طور پر ہی یہ سوچ کر کہ ہوسکتا ہے ان کا پروگرام کچھ اور بن گیا ہو۔وہ مطمئن ہوگیا۔گھر کے پورچ میں گاڑی بند کرکے وہ تھکے ہوئے اعصاب کے ساتھ ڈرائینگ روم میں آیا تو چونک گیا، اس کی ماما کے ساتھ سحرش اور صوفیہ باتیں کررہی تھیں۔اسے دیکھتے ہی وہ دونوں کھڑی ہوگئیں۔صوفیہ نے محمود کے چہرے پر نگاہیں جمائے سلام کیا تو محمود مسکرا اٹھا۔اس نے صوفیہ کے چہرے پر تبدیلی محسوس کی تھی۔تبھی اس نے خوشگوار انداز میں جواب دیا۔پھر ماما کو سلام کرکے وہ سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ دونوں بیٹھیں تو سحرش نے کہا؛

"آپ اب پوچھیں گے کہ میں نے فون کیوں نہیں کیا۔میں تفصیل بتائے دیتی

ہوں۔ ہوا یوں کہ میں محترمہ صوفیہ صاحبہ کو امتحانی سنٹر لے گئی۔گاڑی میں نے ساجد بھائی سے مانگ لی تھی۔ یہ جب تک پیپر دیتی رہی میں یونیورسٹی کا چکر لگا آئی۔گھر واپس آئے تو لنچ میں خاصی دیر ہوگئی۔میں نے سوچا میں خود ہی آپ کے ہاں آجاؤں گی ، اس طرح ڈاکٹر صاحب کو زحمت نہیں ہوگی مگر عین وقت پر ساجد بھائی کو کہیں کام پڑگیا، وہ ہمیں یہاں ڈراپ کرتے ہوئے چلے گئے ہیں اور اب اگر ساجد بھائی واپس نہ آئے تو آپ کو زحمت کرنا ہوگی۔"

"کہہ چکیں یا ابھی مزید تفصیل باقی ہے۔" محمود نے مذاق میں کہا تو سبھی ہنس دیئے۔ تب وہ بڑے خوشگوار انداز میں صوفیہ کی طرف متوجہ ہوگیا۔ٹسٹ اور اس کی فیملی کے بارے میں باتیں کرنے لگا۔ وہ دھیرے دھیرے نپے تلے انداز میں جواب دیتی رہی۔ ان تینوں کے درمیان یونہی عام سی باتیں چلتی رہیں۔تعلیم کی ، آئندہ کیریئر کی، بچپن کی یادیں، موجودہ ماحول اپنے کزن اور نجا نے کیا کیا۔ماما نے کہا:

"آپ لوگ بیٹھیں میں محمود کیلئے چائے بھجواتی ہوں۔"

"اُونہیں ماما! آپ بیٹھیں،میں فریش ہونا چاہتا ہوں۔ پھر سیدھے کھانا ہی کھاؤں گا۔" یہ کہہ کر اس نے سحرش کی طرف دیکھا اور کہا "کیوں! اجازت ہے مجھے؟"

"کیوں نہیں ڈاکٹر صاحب! ویسے بھی تھکا ہوا بندہ اچھا نہیں لگتا۔"

اس نے شرارت بھرے لہجے میں بے باکی سے کہا تو وہ ہنس دیا۔

"بہت بولتی ہو۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھ گیا۔ان دونوں کا آنا اسے اچھا لگا تھا۔ ایک ذرا سی تبدیلی سے ماحول میں خوشگواریت آ گئی تھی۔ جو اسے پرسکون لگ رہی تھی۔

وہ فریش ہو کر آیا تو خاصا نکھرا ہوا لگ رہا تھا۔اس نے سیاہ شلوار قمیض پہنی ہوئی تھی اور اس کے کاندھوں پر آف وائٹ کشمیری شال تھی۔ وہ ان کے پاس بیٹھا تو ماما اٹھ گئیں۔تبھی سحرش نے شرارت بھرے لہجے میں بڑی ہی سنجیدگی سے پوچھا؛

"ڈاکٹر صاحب ،ایک بات تو بتائیں؟"

"پوچھو!"

اس نے بے دھیانی سے کہا:

"یہ جو آپ کالج چھوڑنے کے بعد بہت زیادہ نکھر گئے ہیں، چہرے پر سرخی اور پہلے سے زیادہ وجیہہ ہوگئے ہیں اس کی وجہ بتا سکتے ہیں۔"

تب محمود نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔شرارت سے ہی سہی ،معصومیت میں کیا گیا سوال بہت سارے راز افشا کردینے کا باعث بن سکتا تھا۔وہ راز جو اس کی تنہائی میں کی گئی ریاضتوں کا ثمر تھے۔تب اس نے سوال نظر انداز کرتے ہوئے کہا؛

"میں بہرحال تمہیں اس بیوٹیشن کا پتہ نہیں بتانے والا۔کیونکہ وہ بہت مہنگی ہے۔ چونکہ تم ابھی طالب علم ہو اس لئے افورڈ نہیں کر پاؤ گی۔" اس نے کہا تو صوفیہ نے چونک کر دیکھا۔اس کی آنکھ میں حیرت در آئی تھی۔اس سے پہلے کہ وہ بولتی سحرش نے تیزی سے پوچھا؛

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی ،زیادہ سے زیادہ کتنی مہنگی ہوگی ؟"

"کہا نا کہ تم افورڈ نہیں کرسکتی۔"

محمود نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا تو صوفیہ بولی؛

"چھپا لینے سے تجسس بڑھے گا ،آپ بتادیں،وہ اگر افورڈ کرسکی تو ٹھیک ورنہ وہ دھیان چھوڑ دے گی۔"

"مجھے پتہ بتا دینے میں کوئی حرج نہیں لیکن پھر یہ ضد کرے گی کہ میں اسے اس بیوٹیشن کے پاس لے کر بھی جاؤں ،ظاہر ہے ایسے میں میرے کام کا حرج ہوگا۔"

محمود نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"چلیں ٹھیک ہے نہ بتائیں ،لیکن ایک بات بتائیں کہ محبت کے بارے میں آپ کا نظریہ کیا ہے؟"

سحرش نے پھر سے ویسی بات کہہ دی تو وہ سمجھ گیا ،ضرور صوفیہ سے گپ شپ کے بعد یہ سوال اس کے ذہن میں اٹھ رہے ہوں۔ورنہ وہ اتنی بے باکی سے ایسے سوال نہ کرتی، ہوتا ہے نا کہ کسی شے کی اہمیت کا احساس ہی اسے قیمتی بناتا ہے۔وہ مسکرادیا اور بولا؛

"یہ سوال تمہارے کون سے پرچے میں آنے والا ہے سحرش ؟"

"زندگی کے امتحان میں اس سوال کی بہت اہمیت ہے۔میں نے سنا ہے کہ سارے نمبر ہی

اس کے ملتے ہیں۔"

"میرے خیال میں یہ سوال ابھی تمہارے نصاب میں نہیں اور......"

"نہ ڈاکٹر صاحب! پہلے سوال کی طرح آپ اسے نظر انداز مت کریں ،ہاں اگر آپ اس پر طبع آزمائی نہ کرنا چاہیں تو الگ بات ہے ،صاف کہہ دیں ،میں اپنا سوال واپس لے لوں گی۔"

سحرش بھی اب سنجیدہ ہوگئی۔وہ چھوٹی کلاس کی طالبہ تو نہیں تھی ،یونیورسٹی میں پڑھتی تھی۔ اتنی عقل تو اسے بھی تھی اس کے یوں کہنے پر صوفیہ نے کہا ؛

"یہ سوال میری طرف سے بھی سمجھ لیں۔" صوفیہ نے حددرجہ دلچسپی سے کہا تو محمود نے ایک لمحہ کو اس کی طرف دیکھا اور کہا؛

"محبت ایسا رویہ ہے جو بے اختیار کردے ،اُس کے لئے ،جس سے محبت کی جارہی ہے۔ اس عمل میں صلے کی توقع ایک فیصدی بھی نہ ہو اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ محبت ہمیشہ مثبت راہوں کی طرف لے کر جاتی ہے۔"

"اس پر تو خاصی بحث کی گنجائش نکل سکتی ہے۔"

صوفیہ نے دھیرے سے کہا

"دیکھیں محبت کوئی محدود رویہ تو نہیں ہے نا۔گنجائش نکل سکتی ہے یا نہیں مجھے یہ نہیں معلوم مگر آپ بحث کیجئے،یہ میرا اپنا نظریہ ہے۔اس سے ہر شخص اتفاق یا اختلاف کرسکتا ہے۔"

"تب تو پھر بات ہی ختم ہوجاتی ہے۔"

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"وہ کیسے ؟"

اس نے پوچھا۔

"وہ اس طرح کہ آپ نے اپنا نظریہ بیان کرکے اس پر حتمی ہونے کی مہر لگا دی کہ کوئی جس طرح سمجھے ،آپ اس سے ادھر ادھر نہیں ہوں گے۔"

"پہلی بات تو یہ ہے صوفیہ کہ بحث اور گفتگو میں بڑا فرق ہوتا ہے۔علم جتانے اور علم سیکھنے میں جتنا فرق۔ اور دوسری بات کہ کبھی بھی کوئی نظریہ حتمی نہیں رہا۔اس میں

تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔وقت کے ساتھ ساتھ ذہنی وسعت بڑھتی ہے اور پھر اس کا لازمی اثر نظریات پر پڑتا ہے۔ایک دور میں سمجھا جانے والا مثبت خیال ، کسی دوسرے دور میں منفی ہوسکتا ہے۔"

"اس طرح تو کوئی بات ، کوئی نظریہ حتمی رہا ہی نہیں جیسے رسول عربی ﷺ کے خاتم ہونے میں کیا تبدیلی، اللہ کے واحد اور لاشریک ہونے میں کیا تبدیلی۔"

صوفیہ نے کہا۔

"آپ تو جذباتی ہو رہی ہو!غور کرو۔تم نے جو باتیں کی ہیں وہ قوانین فطرت میں بلکہ اس سے بھی ماروا وہ بنیادیں ہیں جہاں سے اذن تخلیق ہوا۔اصل میں ہم ہر شے کی حقیقت کو الگ کر کے نہیں دیکھتے۔ رائے، تبصرہ، مشورہ، تجویز، اصول، نظریہ، قانون، سب معنی، مطالب اور اپنی ہیت میں الگ الگ ہیں۔"

"پھر بھی آپ نے حتمی......"

"نہیں! اب میں یہ سمجھتا ہوں تو میرے نزدیک محبت کا نظریہ یہی ہے اور یہ بات میں نے چھان پھٹک کر اپنے لئے اپنائی ہے۔"

"تب تو یہ آپ کا ذاتی تجربہ ہوا اور چلیں اسے یوں کہہ لیں، آپ کا اپنا انفرادی نظریہ کوئی کائناتی یا آفاقی نظریہ تو نہیں جس پر سب صاد کرلیں۔"

"یہاں پر آپ کو ایک بات ضرور سمجھنا ہوگی کہ آفاقی سچائی کو سارے انسان نہ بھی مانیں تو وہ سچائی ضرور رہتی ہے۔اپنی جگہ قائم و دائم، وقت بھی اس کو بدل نہیں سکتا۔ سارے انسان مل کر ایک قانون بنالیں، ایک نظریہ پر قائم ہو جائیں تو بھی۔کچھ چیزیں آسمانی ہوتی ہیں اور کچھ زمینی،ان کو سمجھنے کے لئے بھی مختلف معیار چاہیں...... میری بات سے ہر کوئی اختلاف کرسکتا ہے ،یا کل میرے لئے بھی محبت کا یہ نظریہ نہ رہے اور میں خود اس میں تبدیلی کرلوں، یاد رہے صوفیہ۔تبدیلی کا عمل ٹوٹ پھوٹ سے ہی شروع ہوتا ہے۔تعمیر کے لئے تخریب لازمی ہے لیکن ایسا اس وقت ہوتا ہے جب اس سے مزید بہتر نظریہ سامنے آئے۔"

یہ کہہ کر اس نے صوفیہ کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولا؛

"آپ بتائیں آپ محبت کے بارے میں کیا نظریہ رکھتی ہیں۔"

"ابھی تو میں نے اس بارے میں سوچا ہی نہیں ہے۔"

وہ طرح دے گئی۔

"پھر بھی......"

محمود نے اصرار کیا۔

"کہتے ہیں نا کہ محبت کی نہیں جاتی، ہو جاتی ہے۔ ہوتی ہوگی اور جب ہو جائے گی تب دیکھا جائے گا۔"

وہ پھر ٹال گئی۔تبھی سحرش بولی؛

"اب تو آپ اس بیوٹیشن کا پتہ بتا دیں۔"

"تو سحرش سنو! وہ بیوٹیشن محبت ہے۔"

محمود جذب سے بولا تو وہ دونوں چونک گئیں،تبھی سحرش نے ہولے سے کہا؛

"وہ کیسے؟"

"تو سنو۔!محبت اپنی ماہیت میں پانی کی طرح ہوتی ہے ، جہاں جاتی ہے ویسے ہی ڈھل جاتی ہے۔ محبت کی تشریح خود اس کا اپنا وجود ہے۔محبت کی اصل، خوبصورتی ہے۔محبت بدصورتی پیدا کر ہی نہیں سکتی۔یہ اس کی فطرت نہیں ہے۔ ہاں! جہاں یہ جاتی ہے وہ برتن کیسا ہوتا ہے۔ وہ جوہڑ کی طرح ہے یا شفاف جھیل کی مانند، محبت جوہڑ میں بھی کنول کھلائے گی اور شفاف جھیل پر تو پھولوں کی بھرمار ہوتی ہے، بے شمار، مختلف رنگوں اور قسموں کے۔ اس وجود کو صاف اور شفاف بنانے کی ضرورت ہوتی ہے۔محبت تو اپنی فطرت کے مطابق خوبصورتی ہی دے گی۔جو جتنا شفاف ہوگا محبت اتنا ہی خوبصورت اظہار کرے گی، ہمارے اردگرد فطرت خوبصورت ہے، محبت بھی خوبصورت ہے، ہم شفاف ہوں تو سارے پردے ہٹ جاتے ہیں۔"

محمود جذب سے کہتا ہوا ایک دم چونک گیا، جیسے سب کچھ اس کے سامنے نہیں کہنا چاہتا تھا۔

"کہیں محمود، رک کیوں گئے۔"

صوفیہ تیزی سے یوں بولی جیسے ٹرانس سے بولی ہو اور دوبارہ اسی سحر میں کھو جانا چاہتی ہو۔اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، ظفرو نے ماما کا بلاوا دے دیا کہ وہ کھانے کی

میز پر بلا رہی ہیں۔ وہ سبھی اُٹھے۔ وہ کھانے کی میز تک پہنچے ہی تھے کہ ساجد آگیا۔ اس نے کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے پرتکلف کھانا دیکھا اور مصنوعی حیرت سے کہا؛

''واہ جی واہ۔! اتنا پرتکلف کھانا، حیرت ہے۔''

''کس بات کی حیرت بیٹا۔؟''

ماما نے اٹھتے ہوئے پوچھا تو ساجد پوری سنجیدگی ظاہر کرتے ہوئے بولا؛

''یہ صوفیہ تو چلیں مہمان ہے۔مگر یہ سحرش کس خوشی میں یہاں تشریف فرما ہے۔ اور وہ بھی اس قدر پرتکلف کھانے پر جو اس کے شایانِ شان ہی نہیں ہے۔''

''وہ کیوں بھائی......؟''

محمود نے پلیٹ سیدھی کرتے ہوئے کہا۔

''یہ تو ہر کھانے میں کوئی نہ کوئی نقص نکال دیتی ہے۔حتیٰ کہ من وسلویٰ بھی اتر آئے تو یہ اس میں بھی نمک کم ہونے کی شکائت کر دے گی۔''

اس پر سبھی ہنس دیئے تو سحرش احتجاجاً سختی سے بولی؛

''ساجد بھائی! آپ تو بس......''

''کیوں تنگ کرتے ہو۔''

ماما نے مسکراتے ہوئے سحرش کی طرف داری کی۔

''میں اسے تنگ کروں گا، توبہ توبہ......'' اس نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی؛''میں تو سچی بات کہہ رہا ہوں۔ انصاف کا تقاضا تو یہ ہے ناکہ اگر آپ کو کچھ بنانا نہیں آتا تو آپ کو تنقید کا حق حاصل نہیں۔اسے فقط کھانا آتا ہے، پکانے سے اس کی جان نکل جاتی ہے......آنٹی غور کریں، اسے آملیٹ تک نہیں بنانا آتا۔''

''واقعی سحرش تمہیں کھانا بنانا نہیں آتا؟''

ماما نے حیرت سے پوچھا تو وہ خاموش رہی۔ تبھی محمود بول اُٹھا؛

''لڑکیوں کو کم از کم کھانا ضرور بنانا آنا چاہئے اور سحرش تم کھانا اور وہ بھی بہت اچھا کھانا بنانا سیکھو گی، وعدہ کرو اب ساجد کو شکائت نہیں ہوگی۔''

''ٹھیک ہے، بنانا سیکھ لوں گی، مگر اب تو کھانے دیں۔''

اس نے جل کر پلیٹ سیدھی کرتے ہوئے کہا تو سبھی زیرلب مسکرا دیے۔اس

پر ساجد نے کہا؛

''بس آگئی شامت......''

''کس کی......؟''

محمود نے پوچھا۔

''اس کی جس سے سحرش بی بی کھانا بنانا سیکھے گی۔''

''ساجد بھائی بہت ہو چکی، میں کھانا چھوڑ دوں گی۔''

سحرش نے دھمکی دی جس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ تب وہ موضوع بدل کر خوشگوار ماحول میں کھانا کھاتے رہے، کھانے کے بعد بلیک کافی پیتے ہوئے ساجد نے کہا؛

''یہی کافی اگر سحرش بناتی تو......''

''ساجد بھائی پلیز! معاف کر دو۔''

اس نے بے چارگی سے کہا تو پھر سے قہقہہ اُمنڈ پڑا۔ ماما جلد ہی ان کے درمیان سے اُٹھ گئیں۔ وہ کافی دیر تک یونہی باتیں کرتے رہے، ساجد کے آجانے سے موضوع بدل کر رہ گئے تھے۔ قہقہے بکھرتے رہے، رات گئے جب وہ جانے لگے تو ماما نے ڈھیر سارے تحائف صوفیہ کو دیئے۔ کیونکہ اگلے دن اس نے واپس چلے جانا تھا۔ وہ دونوں ماں بیٹا انہیں پورچ تک وداع کرنے آئے۔ صوفیہ نے بھرپور نگاہوں سے محمود کی طرف دیکھا جو اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ ساجد نے گاڑی بڑھائی تو یہ منظر بھی اوجھل ہوگیا۔

☆☆☆

شام کا دھندلکا پھیل چکا تھا۔

صوفیہ اپنے کمرے میں لحاف اُوڑھے خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ خلاؤں میں پھنس گئی ہو۔ایسا ہوتا ہے نا کہ جب انسان کسی خیال کو پرت در پرت کھولتا ہے تو ان پرتوں سے چپکے ہوئے مختلف قسم کے جذبات سے آشنا ہوتا ہے۔ ایک نئے جہاں کے انکشافات کی چکا چوند سے خیرہ ہو جاتا ہے۔جذبات کے بحر میں ڈوبا ہوا شخص اردگرد کے ماحول پر بہت کم توجہ دے پاتا ہے۔ایسے میں محبت سے آشنا ہونے والا من خود میں ہونے والی تبدیلیوں میں کھو جاتا ہے۔ وہ اپنے مقابل کا اپنی حیثیت کے ساتھ موازنہ کرتا ہے تو کبھی خود کو آسمانی رفعتوں اور کبھی زمین پر پڑا ہوا محسوس کرتا ہے۔محبت۔!ایک قوت بن کر رگ و پے میں سرایت کرتی ہے تو مختلف جذبوں کی گھلاوٹ ایک سرور انگیز نشے کا روپ دھار لیتی ہے تب متضاد رویے،جنون فکر اور گرمئ اظہار کی پروا نہیں ہوتی۔بس دل میں ایک مسرت انگیز کسک ہی والہانہ پن عطا کر دیتی ہے کسی وجود میں اٹھنے والا اتنا بڑا طوفان، من کے موسم تبدیل ضرور کرتا ہے۔

''اے کہاں کھوگئی ہو، زندہ بھی ہو یا فوت ہوگئی ہو؟''

نادیہ نجانے کب اس کے کمرے میں آکر اسے یوں ساکت پڑی دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئی تھی۔ چند لمحے ستانے کے بعد جب اس نے ذرا بھی توجہ نہ دی تو اس نے باقاعدہ ہلا کر صوفیہ سے پوچھا؛

''اُو!تم کب آئی؟''

وہ چونکتے ہوئے بولی۔

''میرے آنے کو مارو گولی، اپنی کہو،تم تو ٹھیک ہو؟''

نادیہ نے پریشان لہجے میں پوچھا۔

''میں ٹھیک ہوں۔''وہ آنکھوں سمیت مسکراتے ہوئے بولی اور پھر لحاف سے نکل کر بیٹھ گئی۔ نادیہ نے اس کی یوں حالت دیکھی تو اسے حیرت کے ساتھ تھوڑا دکھ بھی ہوا۔ وہ بڑی شدت سے اس کا انتظار کر رہی تھی، جونہی اس کے واپس آجانے کی اطلاع ملی۔ نادیہ اس کے پاس آن پہنچی۔اسے بڑی بے چینی تھی کہ وہ وہاں کی باتیں سنے۔اس نے صوفیہ کو دیکھتے ہی اندازہ لگالیا تھا کہ کچھ بھی ہے مگر تبدیلی ضرور ہے۔تب وہ بھی اس کے ساتھ لحاف میں گھستے ہوئے بولی؛

''ہاں تو مس صوفیہ! سناؤ احوال اپنے ڈاکٹر صاحب کے؟''

اس کے لہجے میں حد درجہ تجسس تھا۔

''آں......ہاں......''وہ چونکی پھر جلدی سے بولی؛''بہت اچھا،محمود نے بہت اچھا رسپانس دیا ہے۔میری توقع سے بڑھ کر۔''

''بہت خوب!''

وہ خوشی سے بھر گئی پھر وہ اس کی طرف کچھ اور سننے کی اُمید میں دیکھنے لگی۔ صوفیہ اسے تفصیل بتاتی چلی گئی۔

''وہ تم نے سیب والی بات پتہ کی۔''

نادیہ نے یاد دلایا۔

''ہاں!سحرش نے بتایا ہے کہ اب وہ سیب نہیں کھاتا۔''یہ کہہ کر وہ خیالوں میں کھوگئی۔ چند لمحوں بعد وہ خودکلامی کے سے انداز میں بولی؛''ایک بات اور ہے نادیہ؟''

''وہ کیا؟''

وہ ہمہ تن گوش ہوگئی۔

''محبت کے بارے میں اس کا نظریہ مجھے خوبصورت لگا ہے۔ ہوا یوں کہ سحرش سے میری یونہی بحث چل پڑی تھی۔اس نے بے خیالی میں یہ سوال محمود سے بھی کر دیا۔ میں نے اس سے بھی بحث کرنا چاہی لیکن کر نہ سکی کیونکہ میں قائل ہوگئی تھی کتنا خوبصورت کتنا ارفع خیال ہے نادیہ کہ بس محبت کئے جاؤ۔کسی بھی غرض کے بغیر، لالچ اور صلے کے

بغیر۔ اور پھر اس کے خیال میں محبت خوبصورت ہے اور خوبصورتی ہی کا باعث بنتی ہے۔" یہ کہہ کر وہ اپنے خیالوں میں کھو گئی۔ پھر ایک دم بولی: "میں نے بہت غور کیا ہے یار! اس میں تو وجود تک کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔ وہ لمحہ! وہ نقطۂ کمال آجاتا ہے جہاں فقط روحیں اپنی تمام تر پاکبازی کے ساتھ مدغم ہوتیں ہیں۔ محبت کبھی منفی راہوں کا انتخاب نہیں کرتی ہمیشہ مثبت سمتوں کی نشاندہی کرتی ہے۔ اس احساس میں کس قدر زندگی دھڑک رہی ہے، کتنا جاندار احساس ہے کسی کی محبت جانچ لینے کا کس قدر واضح پیمانہ ہے۔ کوئی جتنا اپنے رویئے میں منفی ہوگا اتنا ہی محبت میں ناخالص ہوگا۔"

وہ جوش جذبات سے کہتی چلی گئی اور نادیہ ایک ٹک اس کے سرخ ہوتے چہرے اور نشیلی آنکھوں کو دیکھتی ہی جا رہی تھی۔ وہ لفظوں کے احساس تلے بوجھل ہو رہی تھی۔ جیسے کوئی تیز بارش میں بھیگ کر لطف کے کمال تک پہنچا ہو، نادیہ نے ماحول غیر سنجیدہ کرتے ہوئے کہا:

"صوفیہ ڈیئر! لگتا نہیں کہ جیسے تم فلسفی قسم کی کوئی چیز بنتی جا رہی ہو؟"

"نہیں! یہ فلسفہ نہیں ہے میری جان۔" اس نے ہلکے سے مسکراتے ہوئے کہا "بلکہ سیدھی سادھی عام سی باتیں ہیں، بس سمجھنے کی باتیں ہیں۔ یہ وہ بنیادی باتیں ہیں جن پر تعلق کی عمارت کھڑی کی جا سکے اور جس کے جھروکوں سے دنیا خوبصورت ترین نظر آئے۔ اس میں کوئی بے ڈھنگا پن یا بدصورت منظر نہیں ہو سکتا۔"

صوفیہ نے کہا اور خاموش ہو گئی۔ کافی دیر تک نادیہ نے کوئی سوال نہ کیا تو صوفیہ خود ہی محمود کے نظریہ محبت پر بہت دیر تک بات کرتی رہی اور نادیہ اس میں ہونے والی تبدیلی پر حیرت زدہ ہوتی رہی مگر اظہار نہ کر سکی۔ پھر اچانک صوفیہ بولی:

"نادیہ! پتہ ہے محمود کو اچھا کھانا بہت پسند ہے، اور مجھے کھانا بنانا نہیں آتا۔" یہ کہہ کر اس نے سرخوشی سے مذاق میں کی جانے والی بات کہہ دی۔ "میں اب کھانا بنانا سیکھوں گی اور امید رکھوں گی کہ محمود میرے ہاتھوں سے بنا کھانا کھائے۔"

"ہو...... صوفیہ...... مجھے تو لگتا ہے تم جادوگری سے آئی ہو۔ تم تو بدل گئی ہو۔"

"ہاں! ایسا تب ہوتا ہے جب آگہی کے در وا ہو جائیں اور نادیہ یہ تو عطیہ خداوندی ہے۔ اس کے حصول میں کونسا وقت لگتا ہے؟"

اس نے سرور انگیز نگاہوں سے دیکھا اور خاموش ہو گئی۔ کتنے ہی لمحے ان کے درمیان خاموشی رہی یہاں تک کہ صوفیہ نے باتوں کا سلسلہ پھر سے دراز کر دیا...... وہی باتیں جو اس کے دماغ پر چھا چکیں تھیں۔ اس نے محمود کا ایک ایک انداز ایک ایک طرز نادیہ سے کہی اور اس سے نجانے کیا کیا اخذ کر کے اسے بتاتی رہی۔ باتیں ختم نہ ہوئیں لیکن رات اچھی خاصی بھیگ گئی اور نادیہ نیند کی وادیوں میں کھو گئی۔

☆☆☆

وہ اوائل فروری کے بہار آگہیں دن تھے۔

اس صبح محمود اپنے سینئرز اور باقی ساتھی ڈاکٹروں کے ساتھ وارڈ میں راؤنڈ کر کے واپس آچکا تھا۔ وہ اپنے سامنے دھرے مریضوں کے چارٹ بڑے غور سے دیکھ رہے تھے، ان کے درمیان ہسپتال کی مخصوص خاموشی تیر رہی تھی۔ سینئرز کے جاتے ہی ماحول نرم ہو گیا۔ تبھی اس کے ساتھی ڈاکٹر شہباز، ماہین اور فرید تبصرے کرنے لگے۔

"محمود۔! پرائیویٹ وارڈ میں جو پروفیسر الماس ہے، اس کے بارے میں سینئرز کے ریمارکس پڑھے ہیں تم نے؟"

ڈاکٹر نے چارٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ہوں! پڑھے ہیں۔" اس نے ایک اور چارٹ سے نظریں ہٹائے بغیر کہا؛ "انہیں سکون کی ضرورت ہے، وہ کسی گہرے صدمے سے دو چار ہوئی ہیں۔"

"میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔ دراصل وہ اپنے کام سے نہ صرف اکتا گئیں ہیں بلکہ تھک چکیں ہیں۔"

ڈاکٹر ماہین نے اپنی رائے دی۔

"فرید تمہارا کیا خیال ہے۔"

شہباز نے پوچھا۔

"پروفیسر بیچاری، بوڑھی ہوگئی ہے یار، ایسے میں بندے کے اعصاب جواب دے ہی جاتے ہیں۔ وہ کب تک اس ظالم زمانے سے لڑتی رہتی۔"

"تم کبھی سیدھی بات نہ کرنا۔"

ماہین نے جل کر کہا۔

اس سے پہلے کہ ان میں کوئی زوردار بحث شروع ہوتی۔ چند لڑکے اور لڑکیاں ان کے کمرے میں آگئے۔ ان میں سے آگے سحرش تھی اور اس کے ہاتھ میں پھول تھے۔ محمود نے خوشگوار حیرت سے انہیں دیکھا تو اس نے سلام کہہ دیا۔ ایسا کہتے ہوئے اس کی نگاہوں نے لفظوں کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ سب کی علیک سلیک ہو چکی تو محمود نے کہا؛

"آؤ سحرش اور آپ سب، خوش آمدید...... لگتا ہے آپ سب کسی کی عیادت کے لیئے آئے ہیں؟"

"بالکل، ہماری پروفیسر آپ کے زیر علاج ہیں۔ خدا کے لئے انہیں اپنے تجربات کی نذر مت کیجئے گا۔ ہمیں ان کی ابھی بہت ضرورت ہے۔"

سحرش نے خوشگوار لہجے میں مصنوعی سنجیدگی سے کہا تو وہ زیر لب ہنس دیا۔ پھر بولا؛

"فکر مت کرو، تجربات کے لئے آپ جیسے لوگ ہوتے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے سب کی طرف دیکھا اور کہا؛ "میرا خیال ہے کہ یہاں بیٹھنے کی بجائے پروفیسر صاحبہ کی عیادت کرنی چاہیئے۔"

"ٹھیک ہے آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں۔"

سحرش نے کہا تو وہ بھی ان کے ساتھ چل پڑا۔ سب آئے ہوئے لوگ واپس مڑ گئے تو محمود نے ڈاکٹر ماہین سے کہا؛

"یہ میری کزن ہے، اگر ہو سکے تو ان کے لئے چائے کا بندوبست......"

"ہو جائے گا۔ ویسے آپ کی کزن خوبصورت بھی ہے اور آپ سے بے تکلف بھی، اچھی لگی مجھے۔"

"شکریہ ماہین......"

یہ کہہ کر وہ ان سے جا ملا۔ وہ سب آہستہ آہستہ کاریڈور میں جا رہے تھے۔ محمود کے ذہن میں پروفیسر کا سراپا اُبھر آیا۔ برف سے سفید بالوں، صحت مند جسم اور سرخ گالوں والی اُدھیڑ عمر خاتون، جس کے نقوش کبھی بہت دلنشیں رہے ہوں گے۔ پروفیسر کی گلابی رنگت زمانے کے سرد و گرم کے باعث اب پیتل جیسی ہوگئی تھی۔ محمود نے اگر انہیں

بے ہوشی کی حالت میں نہ دیکھا ہوتا تو بلاشبہ وہ اس عمر میں بھی زندگی سے بھرپور دکھائی دیتی۔ چند قدم اور آگے جانے کے بعد وہ پرائیویٹ وارڈ میں جا پہنچے۔ایک کمرے کے دروازے پر ہلکی سے دستک دے کر وہ اندر چلے گئے۔اتنے سارے شاگردوں کو دیکھ کر پروفیسر صاحبہ کا پژمردہ چہرہ ایک دم سے کھل اُٹھا۔ وہ لیٹی ہوئی تھیں،اپنا دوپٹہ ٹھیک کرتے ہوئے وہ اٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔سحرش نے جلدی سے بڑھ کر انھیں سہارا دیا پھر پھول ان کی گود میں رکھتے ہوئے بولی؛

''پروفیسر! ہم آپ کی جلد از جلد صحت یابی کے لئے دعا گو ہیں۔''

اس کی تقلید میں دوسروں نے بھی پھول اور کارڈز دیئے۔وہ سب کھڑے رہے اور باتیں کرتے رہے۔جب تک وہ وہاں رہے محمود بھی ان کے ساتھ رہا۔کافی دیر بعد وہ لوگ واپس آگئے۔ماہین نے سٹاف کی مدد سے بہترین چائے کا بندوبست کر دیا۔

اسی شام ،گھر جانے سے پہلے محمود نے پروفیسر کے پاس جانا ضروری خیال کیا۔اسے اپنے پاس دیکھ کر وہ خوش ہوگئیں۔ان کے پاس ایک لڑکی بیٹھی تھی جس کے نقوش سے اندازہ ہوسکتا تھا کہ انہیں کی بیٹی ہوسکتی ہے۔وہ محمود کو دیکھ کر ایک طرف ہوگئی تھی۔اس نے بڑے نرم انداز میں پوچھا؛

''اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟''

''بہت اچھا محسوس کر رہی ہوں۔آپ لوگوں نے بھی تو بہت دھیان دیا ہے مجھ پر۔''

''یہ تو ہمارا فرض ہے پروفیسر اور ویسے بھی آپ کی شاگردہ نے بہت زبردست انداز میں آپ کا دھیان رکھنے کو کہا تھا۔''

وہ ہلکے سے مسکراتے ہوئے بولا تو پروفیسر کے لبوں پر بھی مسکراہٹ آگئی۔

''ہاں مجھے بتا رہی تھی کہ آپ کی کزن ہے۔''

''جی ہاں، ایسا ہی ہے مگر وہ بولتی بہت ہے، کلاس میں بھی ایسے ہی کیا یا......؟''

وہ خوشگوار موڈ میں بولا تو وہ ہنس دیں۔

''میں نے اسے بہت ذہین ،سنجیدہ اور پیاری لڑکی کے طور پر پایا ہے۔اچھی

لگتی ہے وہ مجھے۔'' پھر ایک طرف بیٹھی لڑکی کی طرف اشارہ کرتے بولی؛''ڈاکٹر یہ میری بیٹی ہے نورین...... نورین افضل۔''تعارف پر اس لڑکی نے سلام کیا تو محمود نے جواب دیا۔''بس ایسی ہی لگتی ہے مجھے۔''

پھر چند مزید باتوں کے بعد محمود نے کہا؛

''پروفیسر! میں اور میرے ساتھی یہاں ہر وقت موجود ہوتے ہیں۔پرسوں سے میں رات کے وقت یہاں ہوا کروں گا۔ویسے میں نے سب سے کہہ دیا ہے۔آپ کو ذرا سی بھی زحمت نہیں ہوگی۔''

''بہت شکریہ بیٹا! آپ پہلے ہی بہت توجہ دے رہے ہیں...... ویسے میں بھی محسوس کر رہی ہوں کہ بہت جلد صحت یاب ہو جاؤں گی۔''

''اللہ کرے......''

اس نے کہا اور اجازت لے کر وہاں سے نکل گیا۔

محمود رات کی ڈیوٹی پر ہسپتال میں تھا۔گزرتی شب کا دوسرا پہر ڈھل رہا تھا۔ بہار کی لطافتوں نے موسم میں بھری خنکی ختم کر دی تھی۔ہوا جیسے نشہ میں مدہوش ہوکر مست مست سی بڑے نرم انداز میں چل رہی تھی۔وہ اپنے کمرے میں تنہا تھا۔ڈاکٹر شہباز اور سٹاف کی گپ شپ چل رہی تھی۔جس کی آوازیں بھنبھناہٹ کی صورت میں اس تک پہنچ رہی تھیں،تاہم لفظ سمجھ میں نہیں آرہے تھے۔اسے ان کی گفتگو میں ذرا سی بھی دلچسپی محسوس نہیں ہوا کرتی تھی۔ڈاکٹر فرید سونے چلا گیا تھا۔یوں ماحول خوشگوار ہونے کے باوجود سپاٹ سا لگ رہا تھا۔محمود کچھ دیر قبل چہرے سے باتیں کر چکا تھا۔جب تک چہرہ اس سے باتیں کرتا رہا ماحول بھی سرور انگیز تھا۔اس جانے کے سے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی قدرتی منظر سے رنگ نکال دیئے جائیں۔جہاں تھوڑی دیر پہلے چہرہ اپنے وجود کے ساتھ موجود تھا۔اب اس کے نہ ہونے سے ایک اضطرابی کیفیت اس کے من میں تیر رہی تھی۔وہ اٹھا اور کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا۔باہر کے سارے منظر نیم روشن سے تھے مگر اُونگھتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔انہی مناظر میں سے پرائیویٹ وارڈ کی جھلک نظر آئی۔پروفیسر الماس اپنے کمرے سے باہر برآمدے میں کرسی ڈالے یوں بیٹھی تھی جیسے کوئی بت نصب کر دیا گیا ہو۔وہ اپنے خیالوں میں کھوئی ہوئی ،ساکت سی تھی۔

وارڈ کے باہر سڑک پر موجود، کھمبے پر روشن ٹیوب لائٹ کی روشنی سے، پروفیسر کا وجود واضح دکھائی دے رہا تھا۔

شاید انہیں نیند نہیں آ رہی یا پھر کوئی بات ان کی نیند اچاٹ کر دینے کا موجب بن گئی ہو۔ اس نے اپنے طور پر سوچا اور کمرے سے باہر آ گیا۔ وہ چند لمحے کاریڈور میں کھڑا گہرے گہرے سانس لیتا رہا پھر اس کے قدم پروفیسر کی جانب اُٹھ گئے۔ یہ عمل بے اختیار سا تھا۔ جس کی اسے بھی سمجھ نہیں آسکی تھی۔ وہ قریب پہنچا تو پروفیسر کو اس کی آمد کا احساس ہو گیا۔ وہ ابھی دو چار قدم کے فاصلے پر تھا کہ پروفیسر نے گردن گھما کر اسے دیکھا اور مسکرا دی، پھر مسرت بھرے لہجے میں بولی؛

”آئیں ڈاکٹر آپ یقیناً مجھ سے یہ سوال کریں گے کہ مجھے نیند کیوں نہیں آئی؟“

”جی ہاں......یہی دیکھ کر میں آپ کی طرف آ گیا ہوں۔ کیا میں وجہ معلوم کر سکتا ہوں۔“

محمود نے نرم لہجے میں پوچھا۔

”کیوں نہیں“ پروفیسر نے حیرت ملے انداز میں کہا؛ ”مگر وجہ ہے کوئی بھی نہیں۔ بس یونہی نیند نہیں آ رہی۔ زبردستی کی میں قائل نہیں ہوں۔۔۔ بے چاری نرس تو مجھے نیند کی گولی دینا چاہتی تھی مگر میں نے خود ہی منع کر دیا۔ میں بستر پر پڑے اکتا گئی تو یہاں آ کر بیٹھ گئی۔ یہاں مجھے سانس لینا اچھا لگ رہا ہے۔“

”سو جانے کی کوشش کی؟“

اس نے دھیرے سے پوچھا۔

”نہیں۔“ پروفیسر بے ساختہ بولی۔ ”میں نے خود بھی کوشش نہیں کی۔ مجھے یہ تنہائی اچھی لگ رہی تھی۔ اس لئے میں نے بیٹی کو بھی گھر بھجوا دیا۔“

پروفیسر نے کہا تو نجانے کیوں اس کے ذہن میں سرعت سے خیال در آیا کہ جس طرح وہ چہرے کے باعث سو نہیں پا رہا، ہو سکتا ہے کوئی پرانی یاد کوئی ایسا خیال یا مسئلہ پروفیسر کو تنگ کر رہا ہو اور اس کی نیند کے درمیان حائل ہو۔ وہ یہ سوچ رہا تھا کہ مسز الماس نے اسے متوجہ کر لیا۔

”ڈاکٹر پلیز......! آپ کو زحمت تو ہوگی، مگر اپنے لئے اندر سے کرسی اٹھا لائیں۔“

محمود کچھ نہ بولا اور کرسی لا کر پروفیسر کے پاس بیٹھ گیا۔ تب وہ بولی ”بیٹے......! نیند نہ آنا اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے، مسئلہ تو یہ ہے کہ جب نیند نہ آئے تو جاگتی آنکھوں کے خواب پریشان کر کے رکھ دیتے ہیں۔ میں کے ٹو کی چوٹی سر نہیں کر سکتی لیکن اگر میں پریشان ہوتی رہوں کہ کیوں نہیں کر سکتی تو یہ عجیب بات ہوگی۔ حالانکہ میں نہیں چاہتی کہ میں ایسا سوچوں۔“ وہ کہتے کہتے خاموش ہو گئیں۔ چند لمحوں بعد بولیں۔ ”اس سے زیادہ حیرت انگیز بات اور بھی ہے، وہ یہ کہ ایسی بے سروپا سوچیں زندگی کا سہارا بھی ہیں۔ ان کے آگے بندھ باندھتی ہوں تو میری ذات میں دراڑیں پڑنا شروع ہو جاتی ہیں۔ ڈاکٹر آپ جاننا چاہو گے کہ میرے مرض کی وجہ کیا ہے؟“

”بلاشبہ میں جاننا چاہوں گا۔“

اس نے اعتراف کیا۔

”یقین جانو، میں بیمار نہیں ہوں، مگر میرے اردگرد لوگوں نے مجھے بیمار ہونے کا احساس دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ مجھے علاج کروانا چاہیے۔“

”مگر کچھ تو ہوگا جس کی وجہ سے ان کا اصرار تھا اور پھر دوسرا سوال خود بخود بن جاتا ہے کہ آخر آپ اتنے اعتماد سے کیسے کہہ سکتی ہیں کہ آپ بیمار نہیں ہیں؟“

”تم ٹھیک کہتے ہو ڈاکٹر، سامنے کی بات یہی ہے لیکن میرا مسئلہ کچھ ایسا ہے کہ شاید دوسرے سمجھ ہی نہ پائیں۔“

پروفیسر نے کہا تو محمود کو اپنے بدن میں سنسنی اُترتی ہوئی محسوس ہوئی۔ کیا ان کے پاس بھی ایسا کوئی مسئلہ ہے جو یہ دوسروں کو نہیں سمجھا سکیں؟ تب اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے تحمل سے کہا؛

”آپ کہیں، میں اسے سمجھنے کی بھرپور کوشش کروں گا۔“

وہ کتنی ہی دیر تک اس کا چہرہ تکتی رہی یوں جیسے وہ دیکھ تو اس کی طرف رہی ہے لیکن اپنے خیالوں میں کھوئی ہوئی ہے۔ کچھ دیر بعد وہ گھمبیر لہجے میں کہتی گئی؛

”بیٹا......! میں جب تمہاری عمر میں تھی تو مجھے کتابیں پڑھنے کے ساتھ ساتھ

لوگوں کو بھی پڑھنے کا شوق ہو گیا۔ یہ عمر کا وہ دورانیہ ہوتا تھا کہ جس میں شدت اور تیزی فطری امر ہے، میں لوگوں کو جس قدر سمجھنے کی کوشش کرتی، اتنا ہی الجھتی گئی، مگر ایک سکون تھا جو مجھے حاصل ہو جاتا۔ زندگی، انسان اور اس کے رویے میرے پسندیدہ موضوع بن گئے۔ میں نے جانا کہ ہر انسان ایک جیسا ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے انتہائی منفرد ہے۔ یہی انفرادیت میری تمام تر دلچسپی کا محور بن گئی۔ میں انسان کو سمجھنے میں اپنا آپ بھول گئی۔ میں جس معاشرے میں رہ رہی تھی، اس کے بندھن، اس کے اصول و قواعد اور حدود نے مجھے مزید پھیلنے نہ دیا۔ میں ایک محدود دائرے میں سفر کرتی رہی۔ تب میرا خیال تھا کہ زندگی محض بھوک، جنس اور استحصال کے گرد گھوم رہی ہے، میں جو بھوک کو زندگی کا سب سے بڑا المیہ سمجھتی تھی مگر خود بھوک کا تجربہ نہ کر سکی، بھوک کا ذاتی تجربہ کیا ہوتا ہے؟۔ اس سے محروم رہی یہاں تک کہ خالص بھوک کا وجدان میرے حصے میں نہ آیا۔ میں جنس کو زندگی میں سب سے اہم درجہ دیتی تھی مگر خود تجربہ نہ کر سکی۔ کیونکہ تب میرے نزدیک یہ ایک گھناؤنا فعل تھا۔ میں مرد کو محسوس کرتی رہی، اس کے ہونے سے اپنے وجود میں لہریں دریافت کیں لیکن جنس کا تجرباتی پہلو کیا ہوتا ہے، یہ نہیں جانتی تھی۔ میں سمجھتی تھی کہ یہ استحصال ہے جو عام انسان سے لے کر قوموں تک کو خوف میں مبتلا کیے ہوئے ہے۔ یہ نہ ہو تو ہر طرف امن ہی امن ہو سکتا ہے۔" اتنا کہہ کر پروفیسر ہانپنے والے انداز میں خاموش ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ پھر بولیں؛ "بیٹا......! دو دن کچھ نہ کھانے سے بھوک کا اصل ادراک نہیں ہوتا۔ یہ ایک المیہ ہے انسان کا سب سے بڑا المیہ......! اپنے سامنے کھانا رکھ کر دوسرے کی پلیٹ پر نظر رکھنا ایک دوسری قسم کی بھوک ہے، یہ اس سے بھی بڑا المیہ ہے اور پھر بھرے ہوئے پیٹ کے باوجود دوسرے کا کھانا چھین لینا بھی ایک کریہہ بھوک ہے۔ کس کس قسم کی بھوک میرے سامنے آئی، میں بیان نہیں کر سکتی۔" اتنا کہہ کر وہ پھر سے کھو گئیں۔ محمود کچھ نہ بولا بلکہ سفید بالوں والی پروفیسر کے شگفتہ چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ چند لمحوں بعد وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے حتمی لہجے میں بولی؛ "جنس پوری شدت سے اس وقت اپنا آپ منواتی ہے جب اس کا احساس کر لیا جائے۔ میں نے جنس کو خود پر سوار کرنا چاہا لیکن میری ذات کے اردگرد قائم حصاروں نے جنس کو میری ذات فتح نہ کرنے دی۔ میں مغلوب نہ ہوئی۔ مرد کو محسوس کر

کے اپنے وجود میں سنسنی انگیز کیفیات محسوس کرتی رہی مگر جنسی تجربے سے نہ گزر سکی، میں سلگ کر رہ گئی۔ میں نے جنس پر لکھنے والے ادیبوں، فلسفیوں کو تلاش کر کے پڑھا مگر تشنگی تھی کہ بڑھتی گئی۔ الجھنیں تھیں کہ زیادہ ہو گئیں۔ میں نے دیکھا جنس جیسی قوت کو انتہائی گھٹیا انداز میں استعمال کیا جا رہا ہے، استعمال کیا اس قوت کو ضائع کیا جا رہا ہے، ایسا صرف بے مقصدی کی وجہ سے ہے۔ خیر......! پھر میری شادی ہو گئی۔ میں نے مرد کے بارے میں اپنا ایک معیار بنایا ہوا تھا، میں نے اپنے بنائے ہوئے معیار پر اپنے شوہر کو دیکھا، اسے سمجھا اور پرکھا لیکن، تین بچوں کی ماں بن جانے کے باوجود وہ ماورائی اطمینان مجھے نصیب نہ ہو سکا اور میں مضطرب رہی۔ میں نے اپنے نظریات کی راہ مسدود پائی تو خود کو اپنی طالبات میں گم کر دیا۔ میں نے ہمت نہیں ہاری، نت نئے علمی تجربات میں کھوئی رہی۔ میں پھر اپنا آپ بھول گئی۔ جب ہوش آیا تو میں نے استحصال کے خلاف بولنا چاہا، میں اس بارے میں معاشرے سے بات کرنا چاہتی تھی لیکن نہیں کر سکی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں تنہائیوں کے اس خلا میں جا پڑی جہاں اپنا وجود، اپنی ذات بے وزن کر کے خود ہی شرمسار ہو گئی۔ میرا المیہ یہ ہے کہ میں اگر خود کو بھولے رہتی تو زیادہ اچھا تھا۔ لیکن اب جبکہ میں نے اپنی ذات کو تلاش کرنا چاہا تو گنگ ہو گئی۔ بالکل اسی طرح جیسے رومیوں نے خدا تک پہنچنے کے لیے ایک مینار بنانے کی کوشش کی۔ وہ کوشش بار آور نہ ہو سکی اور مینار گر گیا۔ تب وہ شدت حیرت سے گنگ ہو گئے۔ وہ چیخ چیخ کر اپنا مدعا ایک دوسرے سے بیان کرتے مگر ایک دوسرے کو سمجھ نہ سکے اور آخر کار وہ ایک دوسرے کو نہ سمجھنے کی پاداش میں ایک دوسرے کو قتل کرنے لگے۔ میری روح مجھے بہت کچھ کہتی ہے مگر میں اسے سمجھ نہیں پاتی، میں اپنی روح کو سمجھانا چاہتی ہوں تو اپنا مدعا نہیں کہہ سکتی۔ میری ذات اور میری روح کے درمیان ابلاغ نہیں ہے...... جس میں میرا وجود ریزہ ریزہ ہو رہا ہے۔ میں ابھی مرنا نہیں چاہتی ہوں، اس لئے نہیں کہ مجھے زندگی کی طلب ہے، بلکہ اس لئے کہ میں اپنا اظہار چاہتی ہوں۔ میں بے بس ہوں اور یہی بے بسی میرا سب سے بڑا المیہ ہے، جسے کوئی نہیں سمجھتا۔"

یہ کہہ کر پروفیسر نے کرب سے آنکھیں بند کر لیں۔ کتنے خاموش لمحے ان کے قریب سے گذر گئے۔ تب محمود نے کہا؛

"جہاں تک میں سمجھتا ہوں پروفیسر......! آپ کی ذات کا اظہار تو ہو چکا ہے۔ تین بچوں کی تخلیق آپ کے لیے ذات کی تکمیل نہیں تو اور کیا ہے؟"

"میں انکار نہیں کرتی مگر وہ خالصتاً میرا اظہار نہیں، ایک مرد بھی اس میں برابر کا حصے دار ہے۔ میں خالصتاً اپنی ذات کا اظہار چاہتی ہوں۔ مگر میں اب کچھ نہیں کرسکتی، یہی احساس مجھے مارے ڈالتا ہے۔"

وہ بڑے کرب آمیز لہجے میں بولی تو محمود نے تحمل سے پوچھا:

"کیا رکاوٹیں ہیں؟"

"زمانہ، میرے معاشرتی تقاضے، میرا اسٹیٹس، میں ایک ماں ہوں اور وہ بھی بیٹوں کی ماں، ایک بیٹے کی ماں، ایک استاد ہوں اور پھر ایک عورت ہوں۔ میں مانتی ہوں کہ یہ سب میرے اعزاز ہیں اور یہی میرے خوبصورت بندھن، میں جب بھوک، جنس اور استحصال پر اپنے نظریات، تحقیق اور تجربات بیان کروں گی تو آپ بھی اسے خوب سمجھ سکتے ہو کہ میری شخصیت کو کس نظر سے دیکھا جائے گا۔ میں اب لڑ نہیں سکتی۔"

آخری فقرہ کہتے ہوئے پروفیسر یوں لگی جیسے صدیوں سے مسافت طے کر کے بالکل منزل سے چند قدم پہلے تھک کر گر گئی ہو اور اب اس میں اٹھنے کی سکت باقی نہ رہی ہو۔ وہ پھر پژمردہ سی کرسی پر ڈھیر تھی۔ اسے محسوس ہوا کہ اب وہ کچھ کہہ نہ پائیں گی، سو وہ اٹھتے ہوئے بولا؛

"میڈم......! رات بہت گہری ہو گئی ہے۔ اب آپ سونے کی کوشش کریں۔ اگر آپ کہیں تو میں نیند کی گولی......"

"نہیں......! میں خود ہی سونے کی کوشش کروں گی۔"

"چلیں......! ٹھیک ہے، جیسے آپ کی مرضی۔"

محمود نے پیار سے پروفیسر کے ہاتھ پکڑے تو وہ اٹھ گئیں۔ اس نے انہیں بیڈ پر لٹایا، کمبل اوڑھا کے کرسیاں اندر رکھیں اور دروازہ بند کر کے اپنے کمرے میں آگیا۔ جہاں ایک نرس کوئی رسالہ پڑھ رہی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر اٹھ گئی۔ اس نے اسے جانے کے لیے کہا اور خود ایک کاؤچ پر لیٹ گیا۔

اگلا سارا دن پروفیسر اس کے دماغ پر چھائی رہی۔ وہ اپنے مدار میں کس قدر گم ہیں۔ وہ جو اپنا بہت سارا اظہار چاہتی تھی، خود پر ان گنت بوجھ محسوس کرتے ہوئے تہہ در تہہ دفن ہوتی چلی جا رہی تھی، جہاں ان کا اپنا ذاتی وجود فنا ہو کر رہ گیا تھا۔ یہ ایسے ہی تھا جیسے کوئی قوت کسی کو زندگی دینے کی بجائے موت سے ہمکنار کر دے۔ وہ اپنے اندر اور اک شدہ قوتوں کے استعمال نہ کر سکنے کے باعث ققنس کی طرح اپنی ہی آگ میں جلنے لگی تھی۔ وہ اپنی قوتوں سے پیدا ہونے والی کیفیات سے مسرت حاصل نہیں کی بلکہ کھنچاؤ کا شکار ہو گئی تھی۔ روح سے ہم کلامی میں مادیت تو رکاوٹ بنتی ہی ہے کہ روح غیر مادی ہے۔ محبت کے بغیر ساری ریاضتیں، سارے عرفان اور ساری قوتیں غیر فعال ہیں، محبت ہی اسے تحریک دیتی ہے بالکل ایسے جیسے سورج کی روشنی سارے منظر واضح کر دیتی ہے۔ محبت انسان کو بے خوف اور بے نیاز بنا دینے کا وصف رکھتی ہے۔ محبت کو اپنے وجود میں سمائے رکھنا ایک گہرا مجاہدہ ہے۔ جو لہو میں مراقبے کی کیفیات پیدا کر دیتا ہے۔ مجاہدہ اور مراقبہ سے اظہار میں رکاوٹیں آئیں یہ ممکن ہی نہیں۔ اسی شام وہ اپنے سینئرز اور ساتھی ڈاکٹر کے ساتھ راؤنڈ پر گیا تو پروفیسر معمول سے زیادہ ہشاش بشاش تھیں۔ اس کے سینئرز نے خوشگوار لہجے میں پروفیسر سے کہا:

"آپ اب صحت یاب ہیں، چاہیں تو ابھی گھر جا سکتی ہیں لیکن ایک شرط پر؟"

"وہ کیا؟"

پروفیسر نے مسرت بھرے لہجے میں کہا:

"آپ اپنا خیال رکھیں گی۔"

سینئر مسکراتے ہوئے بولا اور چارٹ پر لکھنے لگا۔

"کیوں نہیں ڈاکٹر، میں اپنا خیال رکھوں گی۔" یہ کہہ کر اس نے سوالیہ انداز میں پوچھا: "مجھے ابھی جانا ہوگا یا صبح تک؟"

"جیسے آپ کی مرضی۔"

یہ کہہ کر اس نے چارٹ رکھا اور واپسی کے لیے مڑ گیا۔

راؤنڈ ختم ہو جانے کے بعد جب سینئر چلے گئے تو محمود نے وارڈ بوائے سے پھول منگوا لیے۔ جب وہ پھول لے کر واپس آیا تو وہ اپنے ساتھی ڈاکٹروں میں بیٹھا ہا باتیں کر رہا تھا۔ سب نے حیرت ملی سوالیہ نگاہوں سے دیکھا تو وہ مسکراتے ہوئے بولا؛

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

”پروفیسر صاحبہ کے لیے، ان کی صحت یابی پر......“

”اُوہو......! یہ سب کزن کو خوش کرنے کے لیے کیا جارہا ہے یا واقعی پروفیسر کی شخصیت نے متاثر کر دیا ہے۔“

ماہین نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ اس سے پہلے کہ وہ جواب دیتا، شہباز نے پوچھ لیا؛

”سنا ہے رات تم بہت دیر تک پروفیسر سے گپ شپ کرتے رہے ہو؟“

”ہاں، ایسا ہی ہے اور آج رات بھی ان کے پاس جاؤں گا، اسی لیے پھول منگوائے ہیں۔“

محمود نے خوشگوار لہجے میں کہا تو ان کے درمیان پروفیسر کی شخصیت زیر بحث آگئی۔

رات کے پہلے پہر ہی محمود نے پروفیسر کے دروازے پر دستک دے دی۔ اجازت پاتے ہی وہ اندر چلا گیا۔ وہ تنہا تھیں۔ وہ صاف ستھرے لباس میں نکھری نکھری دکھائی دے رہیں تھیں۔ وہ بیڈ سے ٹیک لگائے کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر کتاب بند کی اور سرہانے تلے رکھ دی اور بڑے پیار سے بولیں؛

”آؤ بیٹا......! بیٹھو، میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔“

انہوں نے بیڈ کے ساتھ رکھی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس نے بیٹھنے سے پہلے پھول اس کی جانب بڑھا دیئے۔

”آپ کے لیے، آپ کی صحت یابی پر۔“ یہ کہہ کر وہ بیٹھ گیا اور پوچھا؛

”آپ میرا انتظار کر رہی تھیں۔ آپ کو کیسے یقین تھا کہ میں آؤں گا؟“

”میرا دل کہتا تھا اور اسی لیے میں اپنے گھر نہیں گئی تھی۔ میرا بیٹا آیا تھا لیکن میں نے اسے واپس بھیج دیا۔ آج چائے بھی رکھی ہے اور میں نے تمہارے لئے اسنیکس بھی منگوائے ہیں۔ چائے کے بغیر گپ شپ کا مزہ ہی نہیں آتا۔ گفتگو پھیکی پھیکی سی لگتی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے انہوں نے زندگی سے بھرپور قہقہہ لگایا۔ پھر اٹھ کر خود ہی تھرماس میں سے چائے انڈیلی، اسنیکس نکالے اور کپ اسے تھما کر بولیں؛ ”تمہارے جانے کے بعد رات بہت اطمینان سے سوئی تھی۔ بہت عرصے بعد مجھے ایسی نیند آئی ہے۔ شاید اس

کی یہ وجہ تھی کہ کسی نے تو مجھے سنا، لوگ مجھ سے بہت جلد بور ہو جاتے ہیں۔ لیکن میرے بچے ہمیں اس سے گھبرانا نہیں چاہیے، ہمارے اردگرد جو اختراعات کی رنگینیاں ہیں اور تسکین ذات کے جذبے کی بنیاد دراصل یہ بوریت ہی تو ہے۔“

”آپ ٹھیک کہتی ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ چند لمحے رکا، چائے کا سپ لیا اور پھر بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا؛ ”میڈم آپ نے انسانی رویوں کو دیکھا، سمجھا اور پرکھا، اس ضمن میں جو کچھ بھی آپ کو میسر آیا کیا اس کا اظہار ضروری ہے۔ اگر ضروری ہے تو کیوں؟“

محمود نے کہا تو پروفیسر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ بلاشبہ رات ہونے والی گفتگو سے کئی سوال جنم لے چکے تھے۔ تب وہ نرم لہجے میں گویا ہوئیں؛

”پہلی بات تو یہ ہے کہ میں نے انسانی رویوں کو سمجھنے کی کوشش ضرور کی مگر میں لب ساحل ہی رہی۔ یہ موضوع تو سمندروں سے بھی زیادہ وسعت اور گہرائی رکھتا ہے۔ اور دوسری بات یہ کہ اس سفر میں جو انسانی راز آشکار ہوتے ہیں۔ انہیں سنبھال رکھنے کی مجھ میں اہلیت نہیں تھی۔ راز بھی تو ایک قوت ہے۔“

”کیا راز کہہ دینے سے وہ قوت زائل ہو جاتی ہے؟“

”نہیں، بلاشبہ نہیں، بلکہ یہ راز اجتماعی علم کا باعث بنتے ہیں۔ تم بتاؤ علم کی روز افزوں ترقی کیسے ممکن ہے؟ ہاں، مجھے اعتراف ہے کہ میں محبت نہیں کر سکی، میری تمام تر تحقیق اور دلچسپی محبت سے عاری تھی اور اس لئے مجھے اظہار کا حوصلہ نہ ہو سکا۔ آخر کار مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ محبت ہی دان کرنے کا حوصلہ بخشتی ہے۔“

”وہ کیسے؟“

محمود نے دلچسپی سے پوچھا۔

”دان کر دینے کا عام مطلب تو یہی ہے نا کہ ہم کوئی شے دے دیتے ہیں تو خود اس سے محروم ہو جاتے ہیں۔ یہ استحصالی نقطہ نظر ہے۔ ایسا وہ لوگ خیال کرتے ہیں جن کی تربیت غیر تخلیقی ہوتی ہے، وہ ذخیرہ تو کر سکتے ہیں کچھ نیا بنا نہیں سکتے۔ تخلیقی لوگ اپنے من میں جلتے ہوئے چراغ کی روشنی بانٹتے ہیں، نئے چراغ روشن کرتے ہیں۔ اس طرح من کے چراغ کی روشنی ختم نہیں ہو جاتی۔ یہاں کنگال یا تہی داماں ہونے کا تصور

نہیں بلکہ اپنے زندہ ہونے کا ثبوت فراہم کرنا ہوتا ہے اور ایسا رویہ محبت کے بغیر ممکن نہیں۔"

"یوں آپ کے نزدیک محبت ہی تمام مسائل کا حل ہے۔محبت ہو جائے تو کسی بھی مسئلہ کی نوعیت ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔"

محمود نے اس انداز سے کہا کہ پروفیسر چونک گئیں۔ وہ چند لمحے سوچتی رہیں پھر بولیں؛

"آپ مجھے کھل کر بتاؤ ،آخر آپ کہنا کیا چاہتے ہو۔اگر کوئی مسئلہ ہے تو ہم اس پر بات کر لیتے ہیں۔ میرا خیال ہے ،اس کا کچھ حل تو نکلے گا۔"

پروفیسر نے اس قدر شفقت اور پیار سے کہا کہ محمود نے چہرے کے بارے میں تفصیل سے کہہ دیا۔ وہ بڑے غور سے سنتی رہیں۔ اس دوران وہ سوال بھی کرتی رہیں اور چائے بھی پیتے رہے۔محمود کہہ چکا تو پروفیسر بولی؛

"آپ کا مسئلہ انہونا نہیں ہے۔دیکھو......! اس سے قطعی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس میں کہیں نہ کہیں، کسی قدر جنسی عوامل کی کارفرمائیاں بھی ہیں۔ڈاکٹر شیرازی کسی حد تک ٹھیک کہتا ہے مگر یہ ایک پہلو ہو سکتا ہے، پوری بنیاد نہیں۔ پھر میں اسے کوئی مسئلہ مانتی ہی نہیں بلکہ یہ تو ایک نعمت ہے۔ جو آپ کو بنا ریاضت کے میسر آگئی ہے۔ اسے ہی تو عطیۂ خداوندی کہتے ہیں۔ آپ کی جگہ کوئی کم ظرف ہوتا تو اب تک اس نے خود کو تباہ کر لیا ہوتا یا پھر وہ تباہ ہو جاتا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ اعلیٰ ظرف ہو اور مثبت سوچ نے آپ کو بچا لیا ہے۔" پروفیسر نے کہا اور پھر چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ خاموشی اس قدر تھی کہ کلاک کی آواز بھی واضح سنائی دینے لگی۔وہ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور پھر بڑے نرم لہجے میں بولی؛"جیسا کہ میں نے کہا ،یہ نعمت ہے بلکہ قوت آپ کو عطا ہو گئی ہے ،اس قوت کو آپ جس طرح چاہو استعمال کر سکتے ہو۔تم محبت کرنے کی اہلیت رکھتے ہو تو ایسا ہوا۔ آپ نے چہرے سے محبت کی تو یہ عرفان ملا ورنہ اگر خوف زدہ ہو جاتے تو میری طرح ٹوٹ پھوٹ کا عمل آپ پر بھی طاری ہو جاتا۔ اصل میں یہ آپ کی تخلیقی قوت ہے جو اپنا اظہار چاہتی ہے۔"

"تخلیقی قوت......؟"

محمود حیران رہ گیا۔

"ہاں۔تخلیقی قوت۔ دیکھو، تخلیق کیا ہے، ایک ذہنی کیفیت۔ ہمارے خیال جو دھندلے سے ہوتے ہیں پھر مقصد کی شبہ پا کر وجود بن جاتے ہیں ،مجھے مختلف دلیلیں دے کر یہ ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ،آپ اگر اس کو گہرائی میں سمجھنا چاہتے ہو تو اسے اپنے طور پر سمجھو۔"

"ہماری روح......! جو ماورا ہونے کے ساتھ ساتھ پر اسرار بھی ہے لیکن خیر......! آپ نے اگر اپنی تخلیقی قوت کا اظہار نہ کیا تو یہ آپ کو اندر ہی اندر سے بھسم کر دے گی۔ وہ چہرہ بذات خود کوئی چیز نہیں اور یہ محض اتفاق ہے کہ اس کی مماثلت آپ کو مل گئی۔ ہو سکتا ہے اس کی کوئی توجیہہ ہو جو ہمیں سمجھ نہیں آرہی یا ہمیں اس کا ادراک نہیں، ہمارا موضوع یہ نہیں۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ آپ اپنے اندر ایک بھرپور تخلیق قوت رکھتے ہو، جو پکے ہوئے پھل کی طرح آپ کو میسر ہے۔اسے اظہار کا راستہ دو، مثبت راستہ، آپ کی شخصیت نکھر جائے گی۔وہ وجدان حاصل ہوگا جس کی طلب میں ہزاروں فنکار مٹی ہو جاتے ہیں۔آپ اپنے اندر ایک بہت بڑی قوت رکھتے ہو۔"

"میڈم ،مجھے بتائیں کہ اظہار کے مثبت راستے کون سے ہو سکتے ہیں؟"

"کوئی سا بھی......! مصوری کرو چاہے برش سے ،چاہے لفظوں سے ،رنگوں سے کھیلو یا لفظوں سے۔سنگ تراشی کرو ،شاعری کرو، کچھ بھی کرو، مگر اپنے عرفان کو اظہار کا راستہ دو۔"

"تو پھر یہ چہرہ......!"

محمود نے کہنا چاہا۔

"یہ مسئلہ نہیں ہے میرے بیٹے ،آپ کے اندر جو تخلیقی قوت ہے اس کا مظہر ہے، ایک علامت ہے ،اشارہ ہے جسے آپ انڈیکیشن کہہ سکتے ہو۔ اب اس کو آپ کیا صورت عطا کرو گے، یہ میں نہیں جانتی۔ ہاں، اتنا ضرور کہہ سکتی ہوں کہ جب چہرہ آپ کی مرضی کے تابع ہو جائے گا تو سمجھنا ،آپ جیسی منزل چاہیں گے ،وہ آپ کے سامنے ہو گی، آگے کیا ہوگا میں یہ پیش گوئی بھی نہیں کر سکتی لیکن اتنا جانتی ہوں کہ مثبت راہیں ہمیشہ روشن منزلوں کی طرف لے کر جاتی ہیں۔"

"مصوری، سنگ تراشی یا شاعری، یہ تو فنون ہیں، انہیں بہر حال سیکھنا پڑتا ہے۔ وقت تو چاہیے نا اس کے لیے۔ میں......"

"لگن، اگر آپ اپنی لگن سے مخلص ہیں تو ساری راہیں آسان ہو جاتی ہیں۔ جیسے کوئی شاعر پہلے ہوتا ہے، شاعری بعد میں ظہور پاتی ہے۔ محض لفظوں کو جوڑنا تو شاعری نہیں ہوتا، ان میں کیفیات، احساسات، جذبے، تجربات، القاء اور الہام ہمک رہے ہوتے ہیں۔ یہ کہاں سے آتے ہیں؟ خیر......! آپ شاعری کیوں نہیں کر لیتے۔"

"شاعری اور میں......" محمود چونکا اور پھر قدرے مسکراتے ہوئے بولا "میڈم میں نے بہت سارے شعراء کو پڑھا ہے۔ بہت انتخاب میرے پاس ہے، یہ شاعری تو جان کنی والا معاملہ ہے۔"

"یہی جان کنی تو اصل چیز ہے۔ کیا چہرہ نئی نئی کیفیات، احساسات، جذبات، القاء اور الہام سے آپ کو روشناس نہیں کرواتا۔ وہ اگر کوئی پھول پیش کرتا ہے تو اس کی خوشبو محسوس ہوتی ہے؟ اس کی آنکھوں کا رتجگا، ہونٹوں کی کپکپاہٹ بیان کر سکتے ہیں؟ پوری سچائی سے جب یہ سب کچھ لفظوں کا روپ دھارے تو دوسرا بھی پوری طرح محسوس کرے۔ اب آپ یہ سوال نہیں کرنا کہ اس سے کیا ہوگا۔ بس اتنا جان لو کہ اگر سورج روشنی دے رہا ہے تو اس میں اس کی بقا ہے۔ وہ اپنی بقا کی جنگ لڑ رہا ہے۔ خیر! میرے ڈیپارٹمنٹ میں ایک استاد ہیں۔ بہت اچھے شاعر ہیں ان سے چند ملاقاتوں کے بعد ہی آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ آپ کیا کچھ کر سکتے ہو۔"

"ٹھیک ہے میڈم لیکن اگر میں شاعری نہ کر سکا تو؟"

"آپ کی قوت کوئی چھین نہیں سکتا۔ وہ عرفان، وہ تخلیقی قوت تو آپ کی اپنی ہے آپ اسے اظہار کا راستہ تو دو۔"

"او کے! یہی ٹھیک ہے۔"

محمود نے مسکراتے ہوئے حتمی انداز میں فیصلہ دے دیا۔ پھر وہ کتنی ہی دیر تک اسی موضوع کے اردگرد گھومتے رہے یہاں تک کہ دونوں کی آنکھوں میں نیند اتر آئی۔ محمود اٹھ آیا تو پروفیسر بھی سکون سے سو گئیں۔

☆☆☆

ساون کی بارشوں نے جل تھل کر رکھا تھا۔

اس دن بھی خوب بارش ہوئی تھی۔ گرمی کا زور ختم ہو کر رہ گیا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی بھیگی ہوائیں مست خرامی میں سرور نچھاور کر رہی تھیں۔ سارا دن سورج نہیں نکلا تھا اور آسماں گھیرے سرمئی بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ہر شے دھل کر نکھر گئی تھی۔ صوفیہ کالج تو گئی لیکن بہت تھوڑی طالبات ہونے کے باعث انہیں پڑھا نہیں سکی۔ چند طالبات تھیں جن سے گپ شپ ہوئی۔ پھر سٹاف روم میں آ کر اس صوفے پر بیٹھ گئی جس کے سامنے کھڑکی تھی اور باہر کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اس منظر میں کھوئی نہ جانے کیا کچھ سوچتی رہی پھر بارش رک گئی۔ کالج بس آ جانے تک اس نے اخبار بھی پڑھ لئے۔ وہ بس میں سوار ہوئی اور تمام رستے بارش سے بھیگی ہر شے کو دیکھتی رہی۔ یہ بارش بھی کتنا زندگی بخش احساس ہے۔ وہ سوچتی رہی کہ اس کا سٹاپ آ گیا۔ وہ اتری، کتابیں اور پرس سنبھال کر اپنے گھر کی طرف چل دی، جو محض چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ نہ جانے کیوں اس دن اسے موسم بہت من موہنا لگ رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ ابھی پھر سے بارش ہو جائے اور وہ خوب نہائے، نہاتے ہوئے شور مچائے دل بھر جائے تو چادر اوڑھ کر خوب مزے سے سو جائے اور نیند میں کوئی بہت ہی دلکش خواب دیکھے۔ اس بارش نے اس کے من کے سارے موسم بھگو کر رکھ دیئے۔

وہ اپنے کمرے میں آئی تو نادیہ اس کے بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی۔ اسے ذرا بھی خوشی محسوس نہیں ہوئی۔ اس وقت وہ تنہائی چاہتی تھی، مکمل تنہائی، جس میں صرف وہ ہو اور اس کی اپنی ذات۔ ایسے میں اگر بارش برس بھی جائے تو کم از کم بھیگنے کی خواہش پوری

نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے کتابیں ایک طرف رکھیں اور تھکے ہوئے انداز میں جوتے اتارنے لگی۔

"لیکچرار صاحبہ......! آج تو بہت تھکی ہوئی لگ رہی ہو؟"

نادیہ نے ہولے سے کہا۔

"تھکی تو نہیں ہوں یار، بس یونہی بوریت ہو رہی ہے۔ کچھ بھی تو کرنے کے لیے نہیں تھا اور پھر موسم بھی تو بڑا عجیب سا ہو رہا ہے نا۔"

اس نے خالی خالی انداز میں دھیرے سے جواب دیا۔

"تو پھر میرے پاس ایک ایسا جادو ہے کہ جس سے تمہاری بوریت لمحوں میں دور ہو جائے گی۔ چاہو تو اطمینان سے منہ ہاتھ دھو کر آجاؤ۔ پھر نہیں کہنا کہ تازہ دم ہونے کا وقت نہیں ملا۔"

"ایسی کیا چیز ہے تمہارے پاس؟"

اس نے کہا اور باتھ روم میں گھس گئی۔

"یہ تو دیکھنے پر پتہ چلے گا، تازہ دم ہو آؤ تو دکھاؤں۔"

نادیہ نے ہانک لگائی۔ کچھ دیر بعد وہ اس کے ساتھ اپنے بیڈ پر تھی۔

"لاؤ دکھاؤ......؟"

اس نے کہا تو نادیہ نے ایک ادبی رسالہ نکال لیا۔ پھر ایک صفحہ نکال کر بولی؛

"یہ دیکھو......! تمہارے محمود میاں شاعری فرمانے لگے ہیں۔"

نادیہ نے بڑے آرام سے کہا تھا مگر صوفیہ کے لئے بم پھٹ گیا۔

"کیا......کیا واقعی......؟" وہ حیرت زدہ رہ گئی۔ پھر جلدی سے بولی؛ "تمہیں غلط فہمی ہوئی ہو گی۔"

"نہیں مجھے غلط فہمی نہیں ہوئی، بلکہ مجھے سحرش نے فون کر کے بتایا تو میں نے رسالہ منگوایا، ورنہ میں کون سا ایسے رسالے پڑھتی ہوں۔"

"لاؤ دکھاؤ۔"

صوفیہ نے انتہائی دلچسپی سے کہا۔

"نہیں، ایسے نہیں۔ میں پڑھ کے سناؤ گی، تم بعد میں پڑھتی رہنا۔"

نادیہ نے گویا اس کا امتحان لے ڈالا۔

"چلو پڑھو۔"

صوفیہ نے لمحوں میں ہار مانتے ہوئے بیڈ سے ٹیک لگائی، تب نادیہ نے خواہ مخواہ گلا صاف کرتے ہوئے کہا؛

"تو عرض ہے......"

مشام جاں تک سکوں اُتارے ، تمہارا چہرہ، شراب چہرہ
خیال مہکیں ہیں جب سے دیکھا تمہارا چہرہ ، گلاب چہرہ
وہ راہبانہ جلال جس میں، ہے عارفانہ جمال پنہاں
صدائے منصور تو سبق ہے،تمہارا چہرہ ، نصاب چہرہ
وہ خواب آذر، وہ عشق لیلیٰ، وہ آہ سسی ،خیال غالب
وہ عاشقوں کے سوال سارے ،تمہارا چہرہ جواب چہرہ
یہ حرف سارے،یہ لفظ سارے، ہویدا جتنے بھی ہوں معانی
میں خود نہ سمجھوں، پڑھوں میں جب بھی تمہارا چہرہ، کتاب چہرہ
جدھر بھی جاؤں، جسے بھی سوچوں، جسے میں چاہوں، تمہی تمہی ہو
مجھی میں پنہاں ،مجھی سے ظاہر، تمہارا چہرہ ،حجاب چہرہ
وہ ریشمی بندھنوں میں باندھے، مجھی کو مجھ سے بھی چھینا جس نے
جنونِ عشق کو ہوائیں دیتا، تمہارا چہرہ عتاب چہرہ
وہ ماہ روشن، وہ نور صبح، خمار آنکھوں پہ رات قرباں
یہ رنگ و خوشبو، نشاطِ گلشن، تمہارا چہرہ، ثواب چہرہ

غزل ختم ہوگئی مگر یہ اس کے تاثرات میں یوں الجھی کہ سدھ بدھ ہی کھو بیٹھی۔

بلاشبہ وہ خیالوں کی دنیا میں بہت آگے، کہیں دور وادیوں میں گم ہو گئی تھی۔ جہاں ہوائیں کیفیات بن جاتی ہیں ،منظر جذبات میں ڈھل جاتے ہیں، پرندوں کی آوازیں الہام میں بدلتی ہیں، موسم القاء اور ہم خود سراپا احساس ہو جاتے ہیں۔ نادیہ کتنی دیر تک اس کے سرخ ہوتے ہوئے چہرے کو دیکھتی رہی۔ پھر اس کی کھلی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرا کر بولی؛

"ابھی زندہ ہو یا فوت ہو گئی ہو؟"

"آں......ہاں......نادیہ......بہت زبردست غزل کہی ہے۔"

وہ ہنوز اسی تاثر میں تھی۔

"غزل چاہے زبردست ہو یا نہ ہو، تمہیں بہرحال زبردست لگے گی۔ میرا خیال ہے کہ یہ غزل تمہارے لیے ہی کہی گئی ہے۔ تمہیں کیا لگتا ہے؟"

"کاش نادیہ! کاش۔ وہ یہ غزل میرے سامنے بیٹھ کر پڑھتا۔ وہ مجھے یہ کہتا کہ میں نے یہ فقط تمہارے لیے کہی ہے تو اس کے بعد چاہے وہ مجھے مرجانے کا حکم دے دیتا تو بخدا میں مرجاتی کوئی ایک بھی لمحہ ضائع کیے بغیر!"

اس نے پورے جذب سے کہا تو نادیہ حیران رہ گئی۔

"صوفیہ......! تم اس قدر سنجیدہ ہو چکی ہو؟"

"ہاں! وہ شخص میرے من میں اُتر گیا ہے اور یقین جانو مجھے خبر ہی نہیں ہوئی۔ وہ میرے خیالوں میں، میری رگوں سرایت کر گیا ہے، کوئی ایک لفظ کہے بغیر۔"

اس کے لہجے میں چھلکتی سچائی کی تصدیق اس کی بھنور آنکھیں بھی کر رہی تھیں۔ تبھی نادیہ نے کہا؛

"تمہیں کیا لگتا ہے کہ جو غزل کہی گئی ہے، یہ لفظ......"

"اس نے میرے سامنے ایک لفظ بھی نہیں کہا جس پر میں یقین سے کہہ سکوں کہ وہ فقط میری ذات کے لیے تھا۔" یہ کہتے کہتے وہ کھو گئی، پھر اچانک بولی؛ "لیکن نہیں۔ یہی تو اعجاز محبت ہے کہ وہ کچھ بھی نہیں کہہ رہا مگر میں سب کچھ سمجھ رہی ہوں۔ بلاشبہ وہ بہت کچھ کہنا چاہتا ہے، اتنا کہ جس کا مجھے گماں بھی نہیں ہے۔ میں اس کی محبت تسلیم کرتی ہوں اور تم گواہ رہنا نادیہ......! میں اس کی وسعتوں اور گہرائیوں کا اندازہ نہیں کر سکتی۔ وہ محبت کرتا چلا جا رہا ہے اور میں......میں تو ذرا حقیقت نہیں رکھتی۔ میری محبت تو محض ذرے کی مانند ہے۔"

"صوفیہ......! ہو سکتا ہے کہ وہ جو کہنا چاہتا ہے کہہ نہیں پاتا۔ ایسے میں رکاوٹیں تو ہوں گی۔"

"ہاں ایسا ممکن ہے مگر ایسا بھی کیا وہ مجھ سے براہ راست کوئی بات نہ کہہ

سکے۔"

آخری لفظ کہتے ہوئے اس کا لہجہ بھیگ گیا تھا۔

"صوفیہ! تمہاری ذات۔ تمہاری اپنی ذات رکاوٹ ہو سکتی ہے۔ تم نے اپنا کیا تاثر دیا ہے، کس طرح خود کو اس کے سامنے پیش کیا، یہ کبھی سوچا تم نے؟ اس کے جو احساس ہیں، وہ تم اس غزل میں دیکھ سکتی ہو اور پھر ذیشان نے نجانے کیا کہا اور کس طرح اس سے کہا ہوگا۔ شاید تمہیں ذیشان کی امانت خیال کر کے......"

"ہاں بہت سارے عوامل ہو سکتے ہیں مگر وہ کوئی بات کیوں نہیں کرتا۔ اپنے احساس مجھ سے کہتا کیوں نہیں؟"

یہ کہتے ہوئے صوفیہ رو دی، آنسو اس کی آنکھوں سے چھلک پڑے اور لفظ جیسے گلے میں اٹک گئے۔ نادیہ نے بڑے پیار سے اس کا سر اپنے کاندھے پر رکھ لیا اور آہستہ آہستہ تھپکتے ہوئے تسلی آمیز لہجے میں بولی؛

"صوفیہ میری جان، ابھی تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ پرسکون ہو جاؤ، فکر مت کرو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

وہ کتنی دیر روتی رہی اور پھر کافی دیر بعد سر اٹھاتے ہوئے بولی؛

"وہ اگر مجھے ذرا سا بھی اشارہ دے دے تو چاہے میں دوسروں کے لیے پتھر ہوں، اس کے لیے موم بن کر پگھل جاؤں گی۔ ویسے ہی ڈھل جاؤں گی جیسے وہ چاہے گا۔" یہ کہہ کر اس نے گہرا سانس لیا اور زخم خوردہ لہجے میں بولی؛ "لیکن نادیہ......! میرے جذبے اتنے سستے تو نہیں کہ ان کا اظہار کروں، اسے خود پہچان لینا چاہئے نا؟"

"فکر مت کرو صوفیہ......! محبت کرتے جانا ہی اصل بات ہے۔ آؤ۔ اب باہر چلیں۔"

نادیہ نے اس کی توجہ بٹائی۔

"کہاں......؟"

وہ ہونقوں کی طرح بولی۔

"ہمارے گھر......چھت پر بیٹھ کر آم کھائیں گے اور تمہارے محمود کی باتیں کریں گے۔" وہ ہنستے ہوئے بولی۔

"نہیں۔" ان نے شدت سے کہا اور پھر دھیرے سے بولی "آج تو کسی صورت میں بھی نہیں ،آج میں اس غزل کے ایک ایک لفظ میں اتروں گی اور خود کو محسوس کروں گی۔"

اس نے رسالہ اٹھاتے ہوئے کہا تو نادیہ اٹھتے ہوئے بولی؛

"چلو جیسے تمہاری مرضی۔میں ابھی چلتی ہوں ،مجھے پتہ ہے کہ تمہیں اب تنہائی چاہیے۔"

صوفیہ نے کچھ نہ کہا بلکہ آنکھیں موند کر لیٹ گئی۔رسالہ اس کے ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔

☆☆☆

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔

کچھ لمحے قبل محمود کو تنہائی میسر آئی تھی۔ساتھی ڈاکٹروں اور نرسوں کے درمیان ہونے والی گفتگو کی گونج ابھی تک دیواروں سے لپٹی ہوئی تھی۔ ان سب کے درمیان وہ بچہ زیر بحث تھا جو بہت ہی نازک حالت میں ان کے پاس لایا گیا تھا اور پچھلے چند گھنٹوں سے اس کے علاج معالجے کے باعث انہیں چند لمحوں کی بھی فرصت نہیں ملی تھی۔ وہ بچہ آگ کی لپیٹ میں آجانے کے باعث جھلسا ہوا تھا۔ اس رات محمود کی ذمہ داری تھی۔سینئر ڈاکٹر کسی ڈنر پارٹی میں مدعو تھے۔اس نے ایک لمحہ کے لئے بھی غفلت نہیں کی بلکہ پوری تندہی سے اس بچے کے علاج معالجے میں صرف اس لئے محو رہا کہ وہ ڈاکٹر ہے، اسے اپنے فرض سے کوتاہی نہیں کرنی چاہیے۔ وہ بچہ تکلیف کی شدت کے باعث سنبھالے نہیں سنبھل رہا تھا۔ اس کی دیکھ بھال کی وجہ سے وہ اب پرسکون تھا۔ وہ سارے اس بچے کے بارے میں باتیں کرتے رہے تھے۔ اس دوران بڑی بڑی آنکھوں والی نرس بالکل محمود کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی اور اس کا دوپٹہ لاپرواہی سے ڈھلکا ہوا تھا۔ محمود کو اس تجاہل کا احساس تھا مگر اس نے توجہ نہیں دی تھی۔ وہ نرس اکثر اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے ایسی گھٹیا حرکتیں کیا کرتی رہتی تھی۔مگر اس کی اندرونی کیفیات کو مشتعل کرنے میں ناکام رہتی تھی۔ محمود نے ہمیشہ اسے نظر انداز کیا تھا۔ کیونکہ اس کا یہ عمل محمود کی نگاہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔

وہ اس وقت کمرے میں تنہا تھا۔ اس نے آنکھیں موند کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی ہوئی تھی۔ ٹیوب لائٹ میں ہر شے واضح دکھائی دے رہی تھی۔ ایک پراسرار

سناٹا طاری ہو چکا تھا۔ اس جھلسے ہوئے بچے کو آرام میں دیکھ کر اس کے اندر ایک خوشی سرائیت کر گئی تھی۔ جس کا احساس اسے سکون بخش رہا تھا۔ ایک ایسا احساس جس کا تاثر روح تک کو سرشار کر رہا تھا۔ وہ ایک نئی طرح کی لذت سے آشنا ہوا تھا، جس نے اسے زندگی کے نئے پہلوؤں سے روشناس کروایا تھا۔ وہ اس تاثر کے دھارے میں بہہ رہا تھا کہ دروازے پر ہولے سے دستک ہوئی۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ دروازے کے فریم میں چہرہ کھڑا تھا۔ وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ وہی الوہی مسکان جس کا بھرپور ساتھ اس کی نگاہیں بھی دے رہی تھیں۔ محمود کو احساس ہوا کہ وہ قدرے بدلی ہوئی ہے۔ غور کرنے پر معلوم ہوا کہ اس کا لباس ہی کسی اور ڈھنگ کا تھا۔ چہرہ نے راجستانی عورتوں کی طرح گہرے سبز رنگ کا گھاگھرا چولی پہنا ہوا تھا جس پر سنہری دھاگوں سے کڑھائی ہوئی تھی۔ وہ ننگے پاؤں تھی۔ شفاف دودھیا پیروں پر چاندی کی پائل چمک رہی تھی۔ بھری بھری گول پنڈلیوں سے کمر تک گھاگھرا تھا۔ کمر کی جلد چمک رہی تھی اور ناف میں کوئی ہیرا نما شے چمک رہی تھی۔ بنا بازوؤں کے پھنسی ہوئی چولی میں سے جسم چھلک رہا تھا۔ بہت محنت سے گندھے ہوئے بالوں میں موتیے کے پھول' مرمریں باہوں میں گلاب اور موتیے کے پھولوں والے گجرے اور ہاتھوں میں مہندی رچی ہوئی تھی۔ لمبی صراحی دار گردن میں چاندی کا بھاری ہار اور کانوں میں بڑے بڑے جھمکے تھے۔ جس کی اوٹ میں گہرا سبز بڑا آنچل دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی اس کے سامنے آ بیٹھی، جہاں کچھ دیر پہلے ڈھلکے ہوئے دوپٹے والی نرس بیٹھی ہوئی تھی۔ چہرے کی آنکھیں کاجل اور حیا سے سجی ہوئیں تھی۔ وہ ان بھنورا آنکھوں میں کھو کر رہ گیا، کتنے ہی لمحے یوں ہی بیت گئے۔ تبھی وہ شوخی سے بولی؛

''ایسے کیا دیکھ رہے ہو' میں وہی ہوں ''تمہاری چہرہ ''

اس نے کہا تو محمود جیسے کسی سحر سے آزاد ہو گیا ہو۔ اس نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے پوچھا؛

''یہ آج تم نے کیا پہنا ہوا ہے؟''

''تمہیں پسند نہیں آیا کیا؟''

اس نے معصومیت بھری حیران کن نگاہوں کے ساتھ سوال کر دیا۔

''بہت اچھا لگا ہے مجھے...... لیکن ایسا لباس ہماری عام زندگی میں تو نہیں چلتا' اگر کوئی دیکھے گا تو......!''

اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''میں صرف تمہارے سامنے ہی ظاہر ہوں، مجھے تمہارے سوا دوسرا کوئی نہیں دیکھ سکتا۔'' پھر چند لمحے اس کی آنکھوں میں دیکھتے رہنے کے بعد بولی: ''آج ہم یہاں نہیں بیٹھیں گے، چلو، باہر کہیں چلتے ہیں۔''

چہرے نے خمار انگیز ادا سے اٹھتے ہوئے کہا اور اپنا سفید دودھیا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ ذرا سا بھی انکار نہ کر سکا اور اس کا ہاتھ تھام کے اٹھ گیا۔ پہلی بار چہرہ کے وجود کا لمس اسے محسوس ہوا۔ اس کے ہاتھ کی حدت سے اسے یوں لگا جیسے جذبات کی ساری گرمی یہیں سمٹ گئی ہو اور جذبات کی یہ گرمی اس کے وجود میں دھیرے دھیرے منتقل ہوتی چلی جا رہی ہو۔ وہ دونوں چہل قدمی کے سے انداز میں کمرے سے نکل کر برآمدے میں آئے اور پھر ہسپتال کی عمارت سے نکل کر باہر پارکنگ میں آ گئے۔ کوئی بھی تو ان کی طرف متوجہ نہیں تھا۔

''چہرہ!''

اس نے اپنی گاڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہوں''

اس نے خمار آلود لہجہ میں ہنکارا بھرا، تو وہ بولا؛

''تم یہیں ٹھہرو، میں گاڑی لے آؤں۔''

''لے آؤ......''

اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ چند منٹوں بعد وہ گاڑی لے آیا۔ چہرہ اس کے ساتھ آ بیٹھی تو محمود نے گیئر لگاتے ہوئے کہا؛

''کدھر جانا ہے؟''

''کہیں بھی، کسی بھی کھلی جگہ پر، جہاں ہم پوری آزادی سے سانس لے سکیں۔''

اس نے اپنی نگاہوں میں سارے جہاں کا پیار سمیٹتے ہوئے کہا۔ محمود نے بغیر کسی منزل کا تعین کیئے گاڑی آگے بڑھا دی۔ تارکول کی لمبی سڑک جو گاڑی کی ہیڈ لائٹس سے

چمک رہی تھی، تیزی سے سمٹتی رہی۔وہ چہرہ کے قرب کے احساس اور خوشبو سے مہکتا رہا۔
پتہ نہیں کتنی دیر تک گاڑی چلتی رہی۔وہ دونوں یوں خاموش رہے جیسے خاموشی کسی زبان کا نعم البدل ہو۔تبھی ایک ویرانا آ گیا۔چہرہ نے گاڑی روک دینے کو کہا محمود نے بریک لگا دیئے۔

''یہیں تھوڑی دیر بیٹھتے ہیں۔''

اس نے سڑک کے پار ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

وہاں چاند کی دودھیا روشنی میں کسی پرانے قلعے کے آثار واضح دکھائی دے رہے تھے۔ ہر طرف پراسرار سناٹا تھا۔جیسے کسی نے جادو کے زور سے ساری آوازیں اس منظر سے سلب کر لی ہوں۔محمود نے گاڑی بند کی اور باہر نکل آیا، چہرہ بھی دوسری طرف سے گھوم کر اس کے پاس آ گئی۔ دونوں نے ہاتھو میں ہاتھ دیئے اور اس طرف بڑھ گئے۔ ان کے پیروں تلے کچی مٹی تھی۔وہ بڑھتے چلے گئے۔یہاں تک کہ اس کھنڈر کے پاس جا پہنچے۔ اس کی دیواریں کہیں سے قائم تھیں اور کہیں سے زمین بوس ہو چکیں تھیں۔چہرہ سرخ اینٹوں سے بنی ایک اونچی دیوار میں موجود محرابی دروازے کے قریب رک گئی۔پھر اپنا آنچل دروازے کے سامنے بچھا کر محمود سے بولی؛

آؤ...... یہاں بیٹھو۔''

محمود اس کی طرف دیکھتا ہوا بیٹھ گیا تو چہرہ بھی اس کے قریب بیٹھ گئی اور اپنا سر اس کے گھٹنے پر رکھ دیا۔آدھی رات کا چاند پورے جذب سے چاندنی لٹا رہا تھا اور وہ دونوں اس چاندنی میں نہائے گم صم تھے۔یوں جیسے پورا ماحول اپنے اندر جذب کر رہے ہوں یا پھر پورا ماحول انہی کی خاموشی سے جامد ہو کر رہ گیا تھا۔خاموشی، پراسرار سناٹا، تنہائی اور خمار انگیز قرب نے دونوں کو نہال کر رکھا تھا۔تبھی اسی حالت میں بیٹھے ہوئے چہرہ نے کہا؛

''میں آج تم سے بہت خوش ہوں۔''

''وہ کیوں بھئی......؟''

''تم نے آج اس بچے کی پورے دل وجان سے دیکھ بھال کی۔اس پریشانی میں تمہارے چہرے سے ٹپکنے والے پسینے کے قطرے میرے لئے ہیرے جواہرات سے کم نہیں۔''

''وہ تو میرا فرض تھا۔''

''تمہارا فرض ہی تو تمہاری عبادت ہونی چاہیے محمود اور انسان جب عبادت کی اصل روح کو سمجھ لیتا ہے تو ہی انسانیت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوتا ہے۔''

''میں نہیں سمجھ سکا کہ تم میرے کام سے اتنا خوش کیوں ہو؟''

''میں نے کہا تھا نا کہ محبت ایک ایسی نعمت ہے کہ جب ہوجائے تو اس کا اظہار ہی ثابت کردیتا ہے کہ جس من میں محبت ہے وہ کیسا ہے ؟ محبت کی فطرت خوبصورتی ہے اور من کی آلودگی رہتی ہی نہیں۔رویہ خود بتا دیتا ہے کہ کس من میں محبت کہاں تک جگہ پاسکی ہے ،کتنا ظرف ہے اس من میں اور تمہارا من بہت ہی خوبصورت ہے محمود، محبت کی خوشبو نے تمہیں مہکا کر رکھ دیا ہے۔''

''اتنی تعریف مت کرو۔لوگ پہلے ہی تمہاری تعریف کرنے پر میرے من کے رازاگلوانے کے لئے تیار بیٹھے ہیں۔میں نہیں چاہتا کہ تمہارا راز افشا کردینے پر تمہیں کھو دوں۔تم جو میری قوت ہو، میرا حوصلہ ہو۔''

''تم مجھے ماردو گے محمود! مجھے اتنا مت چاہو کہ مرنے کا خیال ہی مجھے مار دے۔''

وہ بھیگے ہوئے لہجے میں بولی۔

'' اُوکم آن چہرہ! تم یہ کیسی باتیں کرنے لگی ہو، تمہاری باتیں تو زندگی سے بھرپور ہوتی ہیں، یہ تمہیں کیا ہوا ؟''

''محمود! پتہ ہے ،محبت کے دائروں سے نکل کر جب بندہ عشق کے حصار میں آتا ہے تو پھر ہر شے میں محبُوب دکھائی دیتا ہے۔عشق کی زندگی مسلسل ریاضت میں ہے۔''

''اچھا چھوڑو...... ! مجھے فلسفی نہیں بننا' تم آج یہ لباس......''

''تم نے جو مجھے مختلف انداز میں سوچا ہے تو مجھے خود اپنے آپ پر پیار آنے لگا ہے، کتنے خوش کن تصور ہیں۔تم مجھے کس کس طرح کے روپ میں دیکھنا پسند کرتے ہو، تم نے مجھے خواب آذر بنا کر مجسمہ کی صورت میں سوچا تو جانو اجنتا،ایلورا کے غاروں، وینس کا آرٹ، یونانی دیوتاؤں میں سے ایک، نجانے کیا کیا میرے دماغ میں گھوم گیا، پھر محمود تم نے مجھے عشق لیلیٰ کہا ، تو میں اس لیلیٰ کے تصور میں ڈوب گئی، محلوں میں موجود سجی

سنوری لیلیٰ، جو کسی جھروکے میں کھڑی قیس کے دیدار کی منتظر ہے۔ ذرا محسوس کرو، میں کیسی کیسی کیفیات سے گذری ہوں گی۔ تم نے آہ سسی کہا، تو میں اس جان کنی سے گذری ہوں، جب تپتے ہوئے صحرا میں گرم بگولوں کے درمیان پنوں کے لئے بے تاب سسکتی سسی نے اپنا سفر شروع کیا ہوگا۔ سسی کے پیروں کے زخم میں نے اپنے پیروں پر محسوس کئے اور سسی کی آخری ہچکی...... کس قدر یاس بھری ہوگی اس کا بھی ادراک ہوا ہے مجھے۔ اور وہ خیال غالب!......"

چہرہ کہتے کہتے ایک دم سے شرما گئی۔

"خاموش کیوں ہوگئی ہو......؟"

محمود نے دھیرے سے کہا

"تم شاعر ہونا، یہ تم ہی جانو، بس میرے سارے روپ تمہارے لئے ہیں کیونکہ میں اپنے من سے تمہاری ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگئی۔ ان دونوں کے ہاتھ ایک دوسرے کے ہاتھوں میں تھے اور خاموش تھے۔ یوں جیسے لفظوں سمیت پورے تاثر، کیفیات اور جذبے ایک دوسرے میں منتقل ہورہے ہوں۔ چاند کھنڈروں کے عقب میں چلا گیا تو چہرہ ہوش میں آئی۔ وہ اٹھی اور محمود کو اٹھاتے ہوئے بولی؛

"آؤ چلیں!"

"اتنی جلدی!"

محمود نے حیرت سے کہا۔

"ہاں......اب ہمیں یہاں سے چلنا چاہیے۔"

اس نے کہا تو محمود اٹھ گیا۔ اس نے اپنا آنچل اٹھایا اور سر پر لے لیا۔ واپس آتے ہوئے بھی خاموشی ان کے درمیان ہمکتی رہی۔ چہرے نے اپنا سر اس کے کاندھوں پر ٹکائے رکھا۔ ہسپتال کے باہر چہرے نے گاڑی رکوائی، پھر دروازہ کھول کر اترتے ہوئے کہا؛

"اچھا، اب میں چلتی ہوں۔"

وہ ہاتھ ہلاتی اتر گئی۔ ہمیشہ کی طرح محمود نے اسے جاتے ہوئے نہیں روکا۔ وہ

کچھ دیر نظروں کے سامنے رہی پھر اوجھل ہوگئی۔ محمود نے گاڑی پارک کی اور اپنے وارڈ کی طرف چل دیا۔ وہ برآمدے میں ہی تھا کہ اسے اپنے کمرے سے آتی آوازوں نے چونکا دیا۔ پھر جیسے ہی وہ اپنے کمرے میں گیا۔ ڈاکٹر شہباز نے حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا؛

"تم کہاں چلے گئے تھے محمود؟"

"کیوں کیا ہوا؟"

اس نے پوچھا۔

"ہم یہاں آئے تو تم غائب، کچھ دیر انتظار کے بعد پتہ کروایا تو معلوم ہوا تم پارکنگ سے گاڑی لے کر گئے ہو۔ اتنی رات گئے تم بغیر بتائے نکل گئے ہو' کم ازکم بتا کر تو جاتے۔ ہم پریشان ہوگئے تھے۔"

"کہیں گھر ماما کو تو فون نہیں کردیا۔"

اس نے جلدی سے پوچھا۔

"ابھی نہیں، لیکن ہم سوچ رہے تھے۔"

"اُوہ......!" بے ساختہ اس کے منہ سے نکل گیا۔ پھر فوراً ہی معذرت کرتے ہوئے بولا؛ "سوری......میں معذرت خواہ ہوں، مجھے بتا کر جانا چاہیے تھا۔"

اس نے کہا تو ڈاکٹر ماہین نے اس کی پشت پر دیکھتے ہوئے کہا؛

"ڈاکٹر محمود! یہ تمہاری پشت اور سر کے بالوں پر جلی ہوئی سرخ مٹی کیسے لگ گئی، کہیں کوئی حادثہ......"

اس نے کہا تو وہ چونک گیا۔ وہ انہیں کچھ بھی نہیں بتا سکتا تھا۔ سو بات بدلتے ہوئے پوچھا؛

"اس بچے کی طبیعت کیسی ہے؟"

"وہ تب سے پرسکون ہے۔"

ڈاکٹر ماہین نے کہا تو وہ خود بھی پرسکون ہوگیا۔ اس کے آجانے سے فضا میں اطمینان سا آگیا تھا۔ سب چلے گئے تو وہ بھی کاؤچ پر لیٹ کر چہرے کے ساتھ بیتے ہوئے لمحوں کو یاد کرنے لگا۔

☆☆☆

دسمبر کی ایک چمکتی ہوئی سہ پہر تھی۔

صوفیہ کالج سے لوٹی تو اسے اپنے کمرے میں ٹھنڈک محسوس ہوئی۔ اس کا دل چاہا کہ صحن میں جا کر کھلی دھوپ میں بیٹھے۔ وہ اپنے تھکے ہوئے ذہن کو آرام دینا چاہتی تھی۔ وہ منہ ہاتھ دھوکر کمرے سے نکلی تو اس کی امی نے کہا؛

''تمہیں نادیہ نے بلوایا ہے، پیغام تھا کہ آتے ہی فوراً بتادوں۔''

''اسے کیا افتاد پڑ گئی ؟''

اس نے زیرلب کہا۔

''اب پتر مجھے نہیں معلوم، تم جانو اور وہ۔''

اس کی امی نے کہا تو ایک دم سے جانے کے لئے تیار ہو گی۔ وہ ان کے ہاں گئی تو پتہ چلا کہ نادیہ دوسری منزل کی چھت پر بیٹھی اس کا انتظار کر رہی ہے۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گئی تو اس کا سانس بے ترتیب ہو رہا تھا۔ نادیہ دو کرسیاں ڈالے، درمیان میں دھرے میز پر کنو کی بھری ہوئی ٹرے رکھے، ایک رسالے میں گم تھی۔

''توبہ نادیہ! لگتا ہے تم کے ٹو پر چڑھی بیٹھی ہو۔''

وہ سرخ ہوتے ہوئے چہرے کے ساتھ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''ارے میری جان، ایک نامہ ہے تمہارے نام، دیکھو گی تو ماؤنٹ ایورسٹ پر بھی آنا پسند کرو گی اور تمہاری اطلاع کے لئے فقط اتنا عرض ہے کہ میں یہاں بیٹھی ہی اس لئے ہوں کہ تنہائی میسر آجائے نیچے تو سارے گھر والے ہوتے ہیں۔''

''کیا نامہ ہے وہ؟''

یہ پوچھتے ہی محمود اس کے ذہن میں اتر آیا۔

''تمہارے ڈاکٹر صاحب کی تازہ ترین غزل...... یہ لو رسالہ۔''

نادیہ نے تازہ شمارہ اس کی طرف بڑھا دیا۔

''تم نہیں سناؤ گی مجھے۔''

صوفیہ نے رسالہ پکڑتے ہوئے کہا۔

''نہیں، میں کنو کھاؤں گی تم مجھے سناؤ گی۔ ویسے میں تو پڑھ ہی چکی ہوں۔''

نادیہ نے اس کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا جو سرخ تو پہلے ہی تھا اب اس پر حیا کی چمک در آئی تھی۔ یوں وہ بہت زیادہ خوبصورت دکھائی دینے لگی تھی۔ تبھی نادیہ نے بڑے جذب اور خلوص سے کہا؛

''صوفیہ۔! ایک بات کہوں ؟''

''بولو......!''

وہ میگزین کے صفحات پلٹتے ہوئے بولی۔

''میں اگر لڑکا ہوتی نا میری جان تو یقین جانو، میں اس وقت تم پر ہزار جان سے فدا ہو جاتی۔ آج تم...... آج تم بہت خوبصورت، بہت دلکش لگ رہی ہو، میں لڑکی ہونے کے باوجود تمہارے حسن سے مرعوب ہو رہی ہوں۔''

نادیہ کا لہجہ خمار آلود تھا۔

''اتنا پیار آرہا ہے مجھ پر۔''

صوفیہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''بالکل! اور اس کی وجہ تمہارا چہرہ ہے...... خیر! تم غزل پڑھو، اس کے بارے میں بعد میں بات کرتے ہیں۔''

صوفیہ نے غزل اپنے سامنے کی اور دھیرے دھیرے پڑھنے لگی۔

میں تمہاری ذات میں جو ڈھل گیا تو کیا کرو گے
پھر زمانے کو تم میری آنکھ سے دیکھا کرو گے
حسن نے تجھ کو سنوارا، عشق نے پوجا تمہیں
عام سے پتھر تو بھگواں بنا سوچا کرو گے

تم محبت کے تقاضے بھی سمجھتے ہی نہ تھے
ہم کو دریا کر دیا اور خود کو اب قطرہ کرو گے
اب تو کٹتی جائے گی تنہائیوں کے ساتھ ہی
دشمنی ہم سے ہی کر کے شہر کو اپنا کرو گے
اب تو دل کی بات کہہ دو، ہیں تمہارے منتظر
اس طرح خاموش رہ کر ہم کو تم رسوا کرو گے

''واہ، واہ اپنے ڈاکٹر میاں نے کس کس طرح کے چیلنج کر دیئے ہیں مگر ہمیں تو بس آخری شعر پسند آیا ہے جس میں حال دل کہہ دینے کی بات ہے۔''

نادیہ نے چہکتے ہوئے کہا مگر صوفیہ نہ بولی۔ وہ کتنی دیر تک خاموش رہی، پھر رسالے کو اپنے ہاتھوں میں بھینچتے ہوئے بولی؛

''نادیہ...... یار میرا دل کہتا ہے کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔لیکن جب عقل سے اس بات کو سوچتی ہوں تو جواب نفی میں آتا ہے...... ایسی کیا بات ہے کہ وہ ان غزلوں کے علاوہ اپنا اظہار نہیں کرتا حتیٰ کہ اس نے مجھ سے رابطہ کر لینے کی کوشش تک نہیں کی؟''

''تم نے بھی کون سی اس کی حوصلہ افزائی کی ہے جس سے اسے کچھ پتہ چلے کہ تم بھی کوئی اس کے لئے جذبہ رکھتی ہو۔اب تم خود ہی سوچو،تم خود تو اپنی انا لئے بیٹھی ہو اور چاہتی ہو کہ وہ تمہاری طرف بڑھے اور پھر بقول تمہارے، وہ مرد ہے اور متاثر کر دینے والا مرد......! پھر بھی تم اس انتظار میں ہو......مرد تو مقناطیس ہوتے ہیں۔''

''ٹھیک کہہ رہی ہو تم......!میں اس سے ملی بھی تو محض دو مرتبہ ہوں،وہ حالات کچھ اور تھے اور ان میں کسی تعلق خاطر کی گنجائش نہیں تھی۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگئی۔

تھوڑی دیر بعد اس نے نادیہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا؛''ہو سکتا ہے وہ ذیشان کی وجہ سے کوئی بات نہ کہہ رہا ہو؟''

''ممکن ہے صوفیہ! وہ اپنے تیئں کچھ اور ہی سوچ رہا ہو......؟''

''یہ سب کچھ کیسے معلوم کیا جا سکتا ہے۔۔؟''

''وہ سوچنے کی بات ہے......'' نادیہ نے کہا اور سوچ میں کھو گئی، پھر ذرا دیر بعد

سر اٹھا کر بولی؛''اس سے بھر پور قسم کی بات ہو جس سے سب معلوم ہو سکے۔اب وہ اپنے شہر میں ہے اور ہم یہاں...... یہ تو ملنے سے ہی پتہ چلے گا، نا؟''

''یہ کیسے ہوگا نادیہ......؟''

صوفیہ نے انتہائی حسرت سے کہا تو نادیہ پھر سے جیسے مراقبے میں چلی گئی ہو۔

کافی دیر بعد اس نے سر اُٹھایا اور بولی؛

''مشکل نہیں ہے...... وہ اپنی سحرش ہے نا، اس سے دوستی کس دن کام آئے گی۔ پتہ نہیں کتنی بار مجھے بلا چکی ہے۔میں اس کے ہاں سے ہو آتی ہوں،ویسے بھی وہ امتحان وغیرہ دے کر فارغ ہے۔''

''یہی ٹھیک ہے۔''

''او کے،ڈیئر! بہت جلد ہم تمہیں،بہت اچھی اچھی خبریں دیں گے۔''

''مگر وہ ذیشان لوگ بھی تو سر چڑھے ہوئے ہیں۔مجھے معلوم ہے کہ وہ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے لیکن اس کے لئے میں......''

''صوفیہ جو قدم بھی اُٹھانا سوچ سمجھ کر......''

''مجھے معلوم ہے کہ میں نے کیا کرنا ہے،خیر تم سحرش کے ہاں جانے کا ماحول بناؤ''

''بہت اچھا' جی...... اب تو کنو کھاؤ۔''

''وہ کون سی بات تھی جو تم نے مجھ پر عاشق ہونے کے بارے میں کہی تھی۔''

''آج کل اتنی پرکشش کیسے ہوتی جارہی ہو۔ بڑا نمک آگیا ہے تیرے چہرے پر۔''

''مذاق مت کرو۔''

''بالکل مذاق نہیں ہے صوفیہ، تم پہلے ایسی نہیں تھی۔اب نہ صرف پرکشش ہوگئی ہو بلکہ تمہارا چہرہ بھی چمکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔''

نادیہ نے ایک کنو اٹھا کر اسے دیتے ہوئے کہا تو صوفیہ ہنس دی۔ پھر بولی؛

''اب اس پر میں صرف اتنا کہہ سکتی ہوں کہ میں اس بیوٹیشن کے پاس چلی گئی ہوں جس کا پتہ محمود نے دیا تھا۔''

اس نے یہ کہہ کر گویا بات ختم کر دی۔

☆☆☆

خنک دنوں میں اس دن چھٹی تھی۔

محمود دیر سے بیدار ہوا۔ باتھ روم سے منہ ہاتھ دھو کر وہ ڈرائنگ روم میں آیا تو اسے احساس ہوا کہ اس کی ماما اور پاپا باہر لان میں چمکتی ہوئی دھوپ میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ خلاف توقع اس کے پاپا گھر پر تھے۔ پہلے ان کی ملاقات ناشتے پر کچھ دیر کے لئے ہوا کرتی تھی۔ اور شاید مہینوں بعد ایسا موقع ملتا تھا کہ وہ بہت دیر تک اپنے باپ کے پاس بیٹھ سکتا تھا۔ اسے ایک گونہ خوشی محسوس ہوئی۔ وہ باہر دلان میں آیا تو اس کے پاپا اخبار پھیلائے کہیں کھوئے ہوئے تھے۔ ان سے ذرا پرے اس کی ماما بھی اخبار پڑھ رہی تھیں۔ اس نے قریب جا کر ہلکے سے ہنکارا بھر کر اپنے ہونے کا احساس دیا۔ وہ دونوں چونکے۔ اس کے باپ نے عینک اتاری اور مسکراتے ہوئے کہا؛

''آؤ محمود...... خوب سوئے ہو تم......!''

''جی، پاپا! آج بڑے دنوں بعد یوں آزادی سے سونے کا موقع ملا تھا۔''

اس نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''یہ تمہارا ہاؤس جاب کب تک چلے گا......؟''

اسکے پاپا نے اخبار تہہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''بس پاپا، یہی کوئی دو تین ماہ، ایک آدھ مہینہ زیادہ بھی لگ سکتا ہے، حتمی نہیں کہہ سکتا۔''

اس نے کہا۔

''ناشتہ بناؤں آپ کے لئے، چھوٹے صاحب......؟''

صابراں نے آکر پوچھا۔

''آپ نے کر لیا پاپا......؟''

محمود نے پوچھا۔

''ہاں بھئی ہم نے تو کر لیا......'' پھر نوکرانی کی طرف دیکھ کر کہا۔'' اس کے لئے ادھر ہی لے آؤ۔''

یہ سن کر وہ مڑ گئی...... پھر محمود کے ناشتہ کر لینے تک وہ اسی موضوع پر بات کرتے رہے۔ اس نے چائے کا آخری سپ لے کر کپ رکھا تو اس کے پاپا نے کہا؛

''سنا ہے، یار! آج کل تم شاعری کر رہے ہو؟''

''بس ایسے ہی اوٹ پٹانگ تک بندی چل رہی ہے مگر آپ کو کیسے معلوم ہوا؟''

''مجھے کیوں نہیں معلوم ہوگا۔ مجھے تو یہ بھی پتہ ہے کہ تمہاری کتاب آنے والی ہے۔''

''آپ تو سب جانتے ہیں، مگر کیسے؟''

''وہ جو تمہارا پبلیشر ہے نا، میرے اچھے دوستوں میں سے ہے۔''

''اوہ، تو یہ بات ہے...... خیر یہ تو بتائیں کہ آخر خلاف توقع گھر پر کیسے دکھائی دے رہے ہیں۔''

''اچھا ہوا، تمہی نے یہ پوچھ لیا ورنہ میں کافی دیر سے وہ بات کرنے کی تمہید سوچ رہا تھا جو آج تم سے کرنی تھی اور جس کے لئے میں گھر پر موجود ہوں۔''

''ایسی کیا خاص بات ہے پاپا......؟''

''صرف خاص ہی نہیں، خاصی خاص ہے۔''

اس کے پاپا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اچھا تو پھر کہیں......؟''

''بات یہ ہے بیٹا! میں اور تمہاری ماما یہ چاہتے ہیں کہ اب تمہاری شادی ہو جانی چاہیے۔ ہم نے سوچا ہے کہ زندگی تم نے گزارنی ہے لہٰذا جو کوئی بھی تمہاری پسند ہو یا جس سے تم چاہتے ہو، ہمیں بتا دو تا کہ اس فرض کو نبھانے میں ہماری لئے آسانی ہو

جائے۔"

وہ ساکت سا ہو گیا۔اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اس سے یوں اچانک اس بارے میں سوال کر دیا جائے گا۔سوائے چہرہ کے اس نے کسی سے محبت محسوس نہیں کی تھی اور نہ ہی کوئی خاص پسند تھی۔ان چند لمحوں میں اس نے دور تک جائزہ لے لیا۔ وہ خاموش تھا اور سوچ رہا تھا کہ اس سوال کا جواب کیا دے۔تبھی اس کی ماں نے کہا؛

"تردد نہ کرو بیٹا! اگر کوئی ہے تو کہہ دو۔ہمیں ہر حال میں تمہاری خوشی عزیز ہے۔"

محمود نے اپنی ماما کی طرف دیکھا اور پھر اپنے باپ سے مخاطب ہوا۔

"پاپا میری کوئی پسند نہیں ہے اور نہ ہی میں نے اس معاملے میں سوچا ہے۔ ابھی تو میں اپنا کیریر بنانے کی فکر میں ہوں...... آپ نے اور ماما نے اگر میری شادی کرنے کا فیصلہ کیا ہے تو میں چاہوں گا کہ آپ اپنی بہو بھی خود تلاش کریں۔"

"یہ تمہاری سعادت مندی ہے بیٹا۔"

"لیکن پاپا ایک بات......"

"بولو......"

"پاپا! آپ کی خوشی سر آنکھوں پر لیکن میں اپنا ہسپتال بنانا چاہتا ہوں پھر میں نے مزید تعلیم کے لئے باہر بھی جانا ہے۔"

"یہ ساری باتیں ہمارے ذہن میں ہیں ہم ابھی فوراً نہیں کر دینا چاہ رہے......"

"تھینک یو...... آپ سنائیں، آپ کا بزنس کیسا جا رہا ہے؟"

محمود نے بات بدلتے ہوئے پوچھا تو اس کی ماما چائے بھجوانے کا کہہ کر اٹھ گئیں۔ دونوں باپ بیٹا باتیں کرنے لگے۔محمود کے سارے پلان زیر بحث آئے کہ وہ کیا سوچ رہا ہے اور مستقبل میں کیا کرنا چاہتا ہے، وہ اپنے کیریر کو کس حد تک اہمیت دیتا ہے۔ وہ اگر ہسپتال بنانا چاہتا ہے تو اس میں کاروباری نکتہ نظر کس حد تک ہوگا۔ ایسی ہی باتوں کے بعد رشتہ داروں کی باتیں ہونے لگیں اور انہیں وقت کا احساس تب ہوا جب ماما نے لنچ کے لئے بلایا...... محمود خوش تھا اور مسرور بھی، اپنے باپ سے باتیں کر کے اس کی کئی دنوں کی تھکان ختم ہو گئی تھی۔اسی رات ڈاکٹر ماہین نے اپنے ہاں ایک چھوٹی سی

پارٹی رکھی تھی۔سب ڈاکٹر اکٹھے ہو رہے تھی۔اسے وہاں جانا تو تھا لیکن ابھی کافی وقت تھا اس نے گھر سے نکلنے کا وقت اپنے طور پر طے کر لیا تھا۔اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وہ بیڈ پر پھیل کر لیٹا اور ٹی وی آن کرنا ہی چاہتا تھا کہ آہٹ ہوئی۔اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا، عین اس کی نگاہوں کے سامنے چہرہ مسکرا رہی تھی۔ وہ جلدی سے اٹھ گیا۔وہ بالکل ہی مختلف روپ میں تھی یوں جیسے کوئی پروفیسر کتابیں رکھ کر تھکن دور کرنے کے لئے کسی سے باتیں کرنے کے موڈ میں ہو۔کس کر باندھے گئے بال جس میں سے ایک آوارہ لٹ اس کے صبیح چہرے پر جھول رہی تھی۔ گلابی ہونٹوں کے ساتھ سرخ ہوتے ہوئے گال، کاجل لگی سیاہ آنکھوں میں زندگی سے بھرپور چمکتی ہوئی روشنی لئے وہ اسے دیکھ رہی تھی۔

"آؤ چہرہ......"

محمود نے کہا تو وہ اس کے سامنے پڑی کرسی پر خود کو تہہ کرنے کے سے انداز میں بیٹھ گئی۔ پھر ایک ٹک اس کے چہرے کو دیکھتی چلی گئی۔

"کیا بات ہے تم مجھے یوں کیوں دیکھ رہی ہو؟"

"آج تم خوش ہو نا!......میں بھی خوش ہوں۔"

وہ پلکیں جھپکاتے بولی۔

"ایسا کیا ہوا؟"

یہ کہتے ہوئے وہ ہنس دیا۔

"مجھے تمہارے منصوبے بہت اچھے لگے۔ ایک ہسپتال کی تعمیر، انسانیت کی خدمت اور پھر تمہاری پیاری سی بیوی، تمہارے بچے...... ذرا تصور کرو، کتنا خوش کن ماحول ہوگا......"

چہرہ کھوئے ہوئے انداز میں یہ کہہ رہی تھی اور تبھی محمود کے دل میں آئی کہ عورت تو دوسری عورت کے لئے حسد محسوس کرتی ہے اور یہ چہرہ اس کے لئے...... اس سے آگے وہ نہ سوچ سکا۔ وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی تب اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"میرا شادی کرنا تمہیں کیسا لگے گا......؟"

"بہت اچھا......" اس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے رسان سے کہا، پھر

مسکراتے ہوئے بولی۔ ''میں بھی تمہاری طرح خوش ہوں اور پھر تمہارا یہ فیصلہ بہت اچھا ہے کہ تمہارے والدین ہی لڑکی تلاش کریں۔ان کا وہ مان ، وہ اعتماد، وہ اعتبار، تم پر اور بڑھ گیا ہے جو والدین اپنی اولاد سے چاہتے ہیں۔''

''کیا مجھے ایسا ہی کرنا چاہئے تھا......؟''

''کیوں نہیں، ان کا فیصلہ بہترین ہوگا...... اچھا اب چلتی ہوں۔''

''اتنی جلدی......''

''ہاں تم تھوڑا آرام کرلو۔ پھر پارٹی میں بھی جانا ہے...... بائے۔''

یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف بڑھ گئی اور وہ اسے دیکھتا ہی رہ گیا پھر مطمئن ہوکر آنکھیں بند کرلیں۔

☆☆☆

نادیہ اورصوفیہ دونوں ہی آمنے سامنے خاموش بیٹھی ہوئیں تھیں دونوں ہی اپنی اپنی جگہ خاموش اور گہری سوچ میں کھوئی ہوئی تھیں۔ان کی گہری سوچ کی وجہ ذیشان تھا، چند دنوں بعد ذیشان کے گھر والے رشتہ کی بات پکی کرنے کے لئے ان کے ہاں آنے والے تھے اور انہوں نے فون کر کے پوچھا تھا کہ کب آئیں؟ صوفیہ کے لئے کسی طرح بھی افتاد سے کم نہیں تھا۔ پھر بہت دیر بعد تک اس نے تحمل سے سوچا تو دور کہیں اسے محمود دکھائی دے رہا تھا۔ وہ کسی طرح بھی اس آس سے دستبردار نہیں ہونا چاہتی تھی۔

''پھر کیا سوچا تم نے......؟''

نادیہ کی آواز کہیں گہرے کنویں سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''سوچنا کیا ہے بس میرا تو انکار ہے۔میں کم از کم ذیشان سے شادی نہیں کروں گی۔''

''صرف محمود کے لئے......؟''

''جسے نہ پاسکو وہی سب سے بڑی خواہش بن جاتا ہے مگر یار میری اپنی کوئی حیثیت نہیں، صرف میرا حسن ہی سب کچھ ہے......تم نے شاید غور سے نہیں دیکھا ذیشان کی آنکھوں میں عجیب قسم کی بھوک ہے۔وہ ایک اچھی لڑکی یا اچھی بیوی سے نہیں بلکہ خاندان کی سب سے زیادہ خوبصورت لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔اس خواہش کا وہ انتہائی بھونڈے انداز میں میرے سامنے کئی بار اظہار کرچکا ہے مگر اس کی ایک ادا بھی محمود جیسی نہیں۔''

''تم محمود کی مثال تو اچھے انداز میں دوگی ہی کہ تم اس سے......''

"یہ بات نہیں نادیہ! غور کرو، ذرا سوچو میری ایک ہلکی سی ناگواری پر اس نے سیب تک چکھنا چھوڑ دیا۔ اس نے لفظوں میں معذرت نہیں کی حالانکہ اس میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ اپنی انا کو، اپنی شخصیت کو ذرا بھی نہیں گرنے نہیں دیا لیکن اتنا مضبوط اظہار دیا کہ میں اب تک اپنی اس ناگواری پر شرمندہ ہوں اور پورے دل سے اس کا مداوا چاہتی ہوں۔ کوئی سمجھے یا نہ سمجھے مگر میں جانتی ہوں کہ اس نے میری انا کو پرکھا جانچا، اور اس سطح پر میرے ساتھ برتاؤ کیا۔ اس شعور تک کیا ذیشان پہنچ سکتا ہے؟ قطعاً نہیں۔ وہ ایک بیوی نہیں بلکہ خوبصورت لڑکی پا کر خوش ہونے والا بندہ ہے اور میں نمائش نہیں بننا چاہتی۔"

"وہ تمہیں چاہتا ہے، تمہیں ہر طرح سے خوش رکھ سکے گا......"

"میں سب کچھ قربان کر سکتی ہوں لیکن اپنی انا نہیں، یہ تم بھی جانتی ہو...... وہ میرے حسن سے گھائل ہے۔ آج میں اپنے منہ پر تیزاب پھیر لوں تو وہ مجھ پر تھوکے گا بھی نہیں......"

"اللہ نہ کرے یہ تم کیا اوٹ پٹانگ سوچنے لگی ہوا؟"

"یہی گیان مجھے محمود کی محبت نے دیا ہے۔ تم اس بات کی گواہ ہو کہ وہ محض میرے لئے ایک لڑکا یا مرد نہیں بلکہ اور بہت کچھ ہے...... ذیشان میرا مفتوح ہوگا جبکہ محمود نے مجھے فتح کیا ہے۔ تم عورت ہو نادیہ! جانتی ہو کہ ہار جانے ہی میں تو عورت کی فتح ہے۔"

"وہ میں سب مانتی ہوں مگر یہ دیکھو کہ ہم کس ماحول سے تعلق رکھتی ہیں۔ ہم خاندان کی روایات سے کس طرح لڑ سکتی ہیں۔ ہمارے والدین......"

"میں یہاں تمہاری نصیحتیں سننے نہیں بیٹھی...... مجھے ذیشان سے شادی نہیں کرنی ہے بجائے نصیحتیں کرنے کے کوئی حل سوچو۔"

"کڑے امتحان میں ڈال دیا ہے تم نے......"

"اس امتحان سے گزرنا ہوگا تاکہ محمود یہ سوچے کہ میں نے انکار کیوں کیا، یہی رستہ ہے اس تک اپنے احساسات پہنچانے کا......" صوفیہ نے یہ کہہ کر اپنا تمام تر بوجھ اتار پھینکا اور ہلکی پھلکی ہو کر سکون سے دیوار کے ساتھ ٹیک لگائی۔ کافی دیر تک یونہی

بے خیال سی بیٹھی رہی، پھر اسی حالت میں نادیہ سے کہا: "بھونچال تو اٹھے گا لیکن اسکا مقابلہ کرنا ہوگا۔"

"میں یہ پوچھتی ہوں اگر محمود سے بھی تمہاری شادی نہ ہو سکی تو پھر......؟"

"تو پھر کیا ہوگا، کچھ بھی نہیں...... میں نے اپنے تئیں خود کو اس کے سپرد کر دیا ہے نادیہ! اب جو قسمت میں ہو۔" اس نے دھیرے سے کہا۔ پھر بولی: "اب وہ ملے نہ ملے میں تو اس کی ہوں۔ بس میں یہی بات جانتی ہوں۔"

"خیر کچھ کرتے ہیں...... ہو جائے گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" نادیہ نے جذباتی ہوتے ہوئے بے ربط سے انداز میں صوفیہ کی بجائے خود کو تسلی دیتے ہوئے کہا: "میں جاؤں گی اور اس سے پوچھوں گی بہت جلد جاؤں گی۔"

"ہاں تمہیں جانا چاہیے۔"

صوفیہ نے پرسکون مگر بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ اسی لمحے دو آنسو اس کی آنکھوں میں ڈھلک آئے۔

☆☆☆

وہ اوائل مئی کی گرم سہ پہر تھی۔

محمود تھوڑی دیر پہلے ہی ہسپتال سے واپس آیا تھا۔لنچ کے بعد وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا ایک طبی رسالے کی ورق گردانی کر رہا تھا۔تبھی ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی اس نے ریسیور اٹھایا۔

''ہیلو کون؟''

اس نے پوچھا۔

''اوہ......! زہے نصیب ،تو جناب ڈاکٹر صاحب۔السلام علیکم۔''

دوسری طرف سے سحرش کی شوخ اور زندگی سے بھرپور آواز سنائی دی۔

''وعلیکم السلام......! کہیے کیا حال ہے تمہارا؟۔''

محمود خوش دلی سے بولا۔

''ایک دم ٹھیک ،آپ سنائیں؟''

اس نے لہجے میں ہنوز شوخی تھی۔

''میں بھی ٹھیک ہوں ،سب گھر والے کیسے ہیں۔''

''سب ٹھیک ہیں بلکہ خوش بھی ہیں کہ ہمارے ہاں ایک مہمان آئی ہوئی ہے۔ وہ آپ کے ہاں بھی تشریف لائیں گی بلکہ آپ سے ملاقات کا شرف بھی چاہیں گی۔ محترمہ کا نام ہے نادیہ شریف۔''

''اوہ تو نادیہ آئی ہے؟ کب آئی؟''

''آپ خود ہی پوچھ لیں۔''

سحرش نے کہا تو لمحوں بعد نادیہ کی آواز ابھری۔ رسمی باتوں کے بعد محمود نے دعوت دیتے ہوئے کہا؛

''ہمارے ہاں کب آرہی ہو؟''

''آنے کو تو میں ابھی آجاؤں۔آپ گھر کب ہوتے ہیں؟''

''میں گھر پر ہی ہوں اور کل صبح تک میرے پاس وقت ہی وقت ہے۔تمہیں اندازہ نہیں ہاؤس جاب کتنا مشکل ہو رہا ہے۔مگر......! اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں تمہارے لیئے وقت نہ نکال سکوں۔تم جب بھی چاہو آجاؤ۔''

''تو پھر میں ابھی آرہی ہوں۔''

''میں انتظار کر رہا ہوں۔'' اس نے کہا اور رسمی الوداعی کلمات کے بعد فون بند کر دیا۔تبھی اس کی ماما چائے کا کپ پکڑے ڈرائنگ روم میں آگئی۔چائے پکڑاتے ہوئے اس نے کہا:''ماما......! سحرش کا فون تھا۔ان کے ہاں انکل شریف کی بیٹی نادیہ آئی ہوئی ہے۔ابھی ہمارے ہاں آئے گی۔''

''کب آئی وہ......؟'' وہ سکون لہجے میں بولیں۔

''کل شام۔'' اس نے اختصار سے کہا

''چلیں ٹھیک ہے، ڈنر تو وہ یہیں کرے گی ،خیر، میں دیکھ لیتی ہوں۔''

ماما یہ کہتے ہوئے واپس پلٹ گئی۔اس نے چائے کا کپ لیا اور دوبارہ طبی رسالے میں کھوگیا۔

شام ڈھل رہی تھی جب پورچ میں گاڑی رکی۔پھر کچھ ہی دیر بعد ساجد اور سحرش کے ساتھ نادیہ آگئی۔وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔اس نے ہلکے نیلے پھولوں والی شلوار قمیض اور سفید دوپٹہ اوڑھا ہوا تھا۔سفید ہلکے سینڈل پہنے وہ دھیرے دھیرے قدموں سے ڈرائنگ روم میں آئی۔محمود نے اسے غور سے دیکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔نادیہ نے سلام کہا تو اس نے بڑے نرم انداز میں جواب دیا۔نادیہ ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔

''لیجئے جناب آپ کے مہمان آگئے۔''

ساجد نے صوفے ڈھیر ہوتے ہوئے کہا۔

''آپ تو ایسے کہہ رہے ہیں ساجد بھائی جیسے نادیہ آپ کے لیئے بلائے جان

ہو۔"

سحرش نے موقع لگتے ہی ساجد پر چوٹ کی۔

"تمہارے لیئے ہو سکتی ہے۔کم از کم میرے لئے نہیں۔"

ساجد نے لا پرواہی سے کہا تو نادیہ بولی

"چلیں کسی کے لئے سہی۔ہوں تو......؟"

اس نے کچھ اس انداز سے کہا کہ سبھی ہنس دیئے۔اتنے میں ماما آگئی۔ وہ سب سے بڑے پیار سے ملیں۔ پھر ساجد کے ساتھ ہی صوفے پر بیٹھتے ہوئے نادیہ سے حال احوال پوچھنے لگی۔ کچھ دیر بعد ماما نے کہا؛

"نادیہ بیٹے......! ابھی ڈنر میں خاصا وقت ہے۔میں کچھ نہ کچھ تو بنا ہی رہی ہوں۔تمہاری کوئی خاص پسند ہے تو بتاؤ میں وہ بھی بنا لوں۔"

اس سے پہلے پہلے کہ نادیہ جواب دیتی ساجد جلدی سے بولا؛

"آپ کھیر کے ساتھ جیلی تو بناتی ہی ہیں۔کباب آپ خود کھلاتی ہیں جس کے ساتھ رائتہ بھی ہوتا ہے۔چاول آپ جیسے بھی بنالیں۔میرے لئے اتنا ہی کافی ہے۔"

"آپ سے نہیں پوچھا گیا۔زیادہ پھیلیں مت،گھر چلیں اور کھائیں تڑکے والی دال۔"

سحرش جلدی سے بولی۔

"ہاں جی،تمہیں تو پکانا آتا نہیں۔اب اس گھر میں بھی آکر کوئی مزے کی چیز نہ کھائی تو غلط بات ہے نا۔میں شرط لگاتا ہوں......"

ساجد نے بے تکان کہنا چاہا تو سحرش ٹوکتے ہوئے بولی؛

"میں یہ چیلنج قبول کرتی ہوں۔نادیہ جو بھی کہے گی میں وہی پکا دوں گی۔"

سحرش نے تاؤ کھاتے ہوئے کہا۔

"پک تو جائے گا مگر میری بہن اسے کھائے گا کون۔ہم نے نادیہ کو کھانا کھلانا ہے،اسے سزا نہیں دینی۔"

ساجد مسکراتے ہوئے بولا جس نے جلتی پر تیل کا کام کر دیا۔

"بولو نادیہ......! اپنی پسند کہو" سحرش نے غصہ کھاتے ہوئے چٹکی بجا کر کہا

"بولو، میں وہی پکاتی ہوں۔یہ کیا سمجھتے ہیں مجھے کھانا بنانا نہیں آتا۔"

"میں غم کھا لوگی مائی ڈیئر سحرش،میرے لیئے وہی کافی ہے۔"

نادیہ نے ہنستے ہوئے کہا تو سبھی ہنس دیئے۔

"آنٹی سحرش جذباتی ہوگئی ہے اور اگر اس نے کھانا بنانا ہے تو میں چلا۔"

ساجد نے باقاعدہ اٹھ کر جانے کی اداکاری کی تو سحرش جل گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی ماما جلدی سے بول اٹھی؛

"ساجد نہ تنگ کیا کرو......خیر میں خود ہی کچھ بنا لیتی ہوں۔"

"آنٹی آپ کے ہاتھ کا بنا ہوا کھانا پورے خاندان میں مشہور ہے۔آپ جو بھی پکائیں گی،میں شوق سے کھاؤں گی۔"

"تو اس کا مطلب ہے آنٹی ہی کھانا بنائیں گی۔تھینک گاڈ،میں سحرش کے بنائے ہوئے کھانے سے بال بال بچ گیا۔" ساجد پھر سے شروع ہوگیا۔

"ساجد بھائی......!" سحرش نے سرزنش کی پھر روہانسو ہوتے ہوئے بولی "آنٹی اسے منع کریں نا۔"

"تم اسے چھوڑو،آؤ میرے ساتھ۔"

ماما نے اٹھتے ہوئے کہا۔

وہ چلیں گئیں تو یہ باتیں کرنے لگے۔اس دوران صابراں کولڈ ڈرنک رکھ گئی تھی۔

خوشگوار ماحول میں ڈنر ختم ہوا۔سحرش نے بہت مزے کی چیزیں بنائی تھیں اس کا انکشاف ڈنر کے بعد ہوا۔ ساجد اور سحرش چلے گئے۔محمود کے ذہن میں تھا کہ نادیہ اس سے ملنا چاہتی ہے۔ اس نے سوچا ہو سکتا ہے کوئی ایسی بات ہو جو وہ سب کے سامنے نہ کہہ پاسکے۔تبھی اس نے ماما سے کہا؛

"ماما......! میں نادیہ کو گھمانے لے جا رہا ہوں۔"

"کیوں نہیں بیٹا......! جاؤ" ماما نے خوش دلی سے کہا۔

کچھ دیر بعد وہ نادیہ کو لئے قریبی پارک کی طرف جا رہا تھا۔ نادیہ اس کے ساتھ والی سیٹ پر خاموش بیٹھی تھی اور محمود انتظار میں کہ وہ کوئی بات کہے۔ پارک آجانے

تک ان کے درمیان خاموشی طاری رہی محمود نے پارکنگ میں کار کھڑی کی اور پھر دھیمے قدموں سے نادیہ کو لے کر پارک میں چلا گیا۔ اس پارک کی خوبصورتی سے بات شروع ہوئی تو باتیں پھیلتی چلی گئیں۔ یونہی عام سی باتیں۔ وہ دونوں کولڈ ڈرنک لئے ایک سنگی بنچ پر جا بیٹھے تو نادیہ نے پوچھا؛

"یہ آپ ایک دم سے شاعری کیسے کرنے لگے؟"

"اس میں اتنی حیرت کی کیا بات ہے۔ میں ایسا کر سکتا تھا تو میں نے کیا، میں اگر چاہوں تو سنگ تراشی بھی کر سکتا ہوں، مصوری بھی......خیر......! تم نے میری شاعری پڑھی؟"

"ہاں، پڑھی ہے اور اس کے بارے میں خوب سوچا بھی ہے۔"

"ایسا ہے کیا؟" وہ ہنستے ہوئے بولا

"ہاں......!" یہ کہہ کر وہ اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر بولی "میں نے کہیں پڑھا تھا یا شاید سنا ہے کہ فنون لطیفہ خصوصاً شاعری محبت کے بغیر ہو ہی نہیں سکتی۔ آپ کی شاعری میں بھی کیا یہی بنیاد ہے، کیونکہ آپ خاصے رومانوی شاعر واقع ہوئے ہیں؟"

"نادیہ......! محبت تو ہر شے کی بنیاد ہے اور ایک مسلمہ حقیقت ہے، میں اگر نفرت بھی کروں گا تو اس کی تہہ میں فقط محبت ہی ہوگی۔"

"چلیں، اسے دوسری طرح سے دیکھتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ شاعر کے سامنے اس کا محبوب ہوتا ہے۔ جیسے کہ وہ آپ کی غزل تھی، "تمہارا چہرہ" ظاہر ہے اس میں آپ کا مخاطب آپ کا محبوب ہی رہا ہوگا۔ وہ محبوب کون ہے کوئی خیالی محبوبہ یا پھر اس کا کہیں وجود بھی ہے۔"

اس نے بہت مشکل اسے اپنا مدعا کہا تو وہ دھیرے سے مسکراتے ہوئے بولا؛

"تم شاید میری بات کا یقین نہ کرو مگر حقیقت یہ ہے کہ میرا محبوب اپنا وجود رکھتا بھی ہے اور نہیں بھی۔ وہ تخیل بھی ہے اور حقیقت بھی تم اسے شاعرانہ خیال کہہ سکتی ہو۔ ویسے ابھی اس کی اصل حقیقت مجھ پر نہیں کھلی۔"

اس نے پوری سچائی سے کہہ دیا۔

"کون ہے وہ؟" نادیہ کو یہ پوچھتے ہوئے اپنا سانس بند ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر کھوئے ہوئے لہجے میں بولا؛

"تم یقین کرو مجھے خود نہیں پتہ۔"

"اس کا مطلب ہے کوئی خیالی محبوبہ۔" اس نے کریدتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں، خیالی محبوبہ تو وہ ہوتی ہے جو اپنی سوچ کے تابع ہو۔ جس کے خاکے میں رنگ اپنی مرضی سے بھرا جا سکے۔ وہ ایسی نہیں ہے، وہ تو خود رنگوں سے بھرپور دھنک ہے، بہت بھرپور، بہت خوبصورت۔"

"آپ کسی نہ کسی ہستی سے محبت ضرور کرتے ہیں۔"

"بالکل پوری سچائی سے، پوری جان سے کرتا ہوں۔؟"

"اس کا کوئی نام پتہ تو ہوگا؟"

"اس کا نام...... چہرہ ہے، وہ میرے من میں رہتی ہے۔ تم اسے میرے لفظوں میں تلاش کر سکتی ہو۔" یہ کہتے ہوئے خیالوں میں کھو گیا یوں جیسے خود کلامی کر رہا ہو۔

"چلیں محترم شاعر! چھوڑیں اسے، فرض کریں اگر کوئی لڑکی دل ہی دل میں آپ کو پورے خلوص سے چاہتی ہے اور آپ سے بھرپور محبت کرتی ہے، بقول آپ کے پورے خلوص سے، پوری جان سے تو ایسی صورت میں آپ اسے کہاں ایڈجسٹ کریں گے۔"

نادیہ نے ایک اور طرح سے کوشش کی۔

"ایڈجسٹ تو وہ ہو چکی ہے" محمود نے حتمی لہجے میں بے ساختہ کہا پھر چند لمحے نادیہ کے چہرے کی طرف دیکھ کر بولا "محبت کوئی ایویں سی شے تو نہیں ہے۔ ایک لامتناہی قوت ہے اگر وہ لڑکی خالص محبت کرتی ہے تو ملنا یا نہ ملنا، ایڈجسٹ ہونا یا نہ ہونا کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اس نے محبت کر لی تو ساری دنیا سے کٹ گئی۔ محبت تو ہے ہی کھو دینے کا نام، جب اپنا آپ کھو دیا تو باقی کیا بچا۔ نادیہ محبت بڑا پاکیزہ جذبہ ہے۔ پاکیزگی ہمیشہ سے روح کو توانا کرتی ہے۔ مضبوط اور توانا روح والے لوگ غلط راہوں کی طرف بڑھ ہی نہیں سکتے اگر وہ ایسا کریں تو وہ جان لیں ان کے اندر جو محبت پڑی ہے وہ آلودہ ہے۔ ان کے جذبوں میں کھوٹ ہے۔"

"آپ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ فلسفی نہیں ہو گئے۔"

نادیہ نے ماحول کا بوجھل پن دور کرنے کی خاطر مسکراتے ہوئے کہا۔

''یہ سیدھی سادھی باتیں ہیں، کوئی فلسفہ نہیں۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''لیکن وہ جو محبت کر رہی ہے، اپنے محبوب کو نہ پا سکی تو محبتوں کا سفر رائیگاں جائے گا۔ چاہے اس کے جذبوں میں سچائی ہے، اک ذرا سی آلودگی بھی نہیں۔''

نادیہ نے بحث شروع کر دی۔

''محبتوں کا سفر رائیگاں نہیں جاتا، اگر اس نے فقط پالینا ہی اپنی منزل ٹھہرالی ہے تو اس نے محبت کو محدود زاویہ نگاہ سے دیکھا ہے، سمجھا ہے اور سوچا ہے۔''

''چلیں چھوڑیں ان باتوں کو، مستقبل میں کیا ارادہ ہے؟''

نادیہ نے ایک دم سے بحث ختم کر دی۔

''ایک ہسپتال میرا خواب ہے جسے میں ضرور پورا کروں گا۔ باقی جو قسمت میں ہوگا۔''

اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''شادی نہیں کرنی؟''

اس نے شوخی سے پوچھا۔

''کروں گا، جب میرے والدین چاہیں گے، ان کی مرضی سے۔'' وہ اس کی طرف دیکھتا ہوا بولا ''آؤ! تمہیں اچھی سی آئس کریم کھلاؤں۔ اس کے لیے ہمیں مارکیٹ تک جانا ہوگا۔''

''چلیں......!''

نادیہ نے اٹھتے ہوئے کہا تو وہ بھی اٹھ گیا۔ دونوں خوشگوار موڈ سے پارک سے نکلے ان کا رخ مارکیٹ کی طرف تھا۔

☆☆☆

نادیہ واپس اپنے شہر آ چکی تھی۔

صوفیہ جو اس کی آمد کا شدت سے انتظار کر رہی تھی، فوراً اس کے پاس پہنچ گئی۔ نادیہ نے لفظ لفظ ساری باتیں اس سے کہہ دیں۔ کس طرح اس نے سوال کئے اور ان سوالوں کے جواب کیا تھے۔ وہ چمکتی آنکھوں اور پرسکون سانسوں کے درمیان بنا کوئی تاثر ظاہر کئے سنتی رہی۔ اسے خود احساس ہوا کہ زندگی میں کبھی اس نے اتنے غور سے کوئی بات نہیں سنی تھی۔ وہ لفظوں کے تاثرات اپنے ذہن میں اتارتی چلی گئی۔ ساری باتیں کہہ دینے کے بعد نادیہ نے اپنے بیگ سے ایک کتاب کے دو نسخے نکالے۔

''یہ محمود نے دی ہیں، ایک تمہارے لئے اور ایک میرے لئے۔ ہم جب آئس کریم کھانے گئے تو وہیں مارکیٹ میں سے اس نے شاعری کی پہلے ایک کتاب خریدی، پھر اسی طرح کی ایک اور کتاب خرید لی تمہارے لئے۔ یہ اس کا پسندیدہ شاعر ہے۔''

صوفیہ نے کتاب کو بڑے پیار سے تھاما جسے وہ کوئی کانچ کی ہو۔ وہ کتنی دیر تک صفحات الٹتی رہی اس دوران پر ہول سناٹا بڑھ گیا تو نادیہ نے سکوت توڑا:

''صوفیہ......! میری مانو تو ذیشان کو اپنا لو، وہ تمہیں پیار کرتا ہے، چاہتا ہے تمہیں، مجھے نہیں لگتا محمود کی دلچسپی تم میں ہے اور اگر ہے تو وہ کبھی اس کا اظہار نہیں کرے گا۔''

''پگلی ہو تم......! اگر محمود بھی مجھے نہ ملے تو کوئی پرواہ نہیں۔ ذیشان یا کوئی اور، اب میری محبت میں کسی وجود کی کوئی حیثیت نہیں۔''

صوفیہ نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔

"پاگل نہیں بنتے۔ زندگی ان جذباتی باتوں کے سہارے نہیں کٹتی۔ایک وقت آئے گا جب تمہیں یہ سب جوانی کا احمقانہ پن لگے گا۔وہ ہاؤس جاب ختم کرے گا، باپ کی اتنی جائیداد ہے کہ آسانی سے اپنی خواہش پوری کرسکتا ہے۔ وہ جس لڑکی سے بھی چاہے گا،اس کی شادی ہو جائے گی۔تم اپنے زندگی پر خزاں کا موسم کیوں طاری کر رہی ہو؟"

"نادیہ میری جان......! اب زندگی کے سارے موسم ،سارے رنگ ،ساری خوشیاں اور سارے غم محبت کے اس تصور میں سمٹ چکے ہیں جسے حاصل زندگی کہا جا سکتا ہے۔ میں تو محبت کے ابجد سے بھی واقف نہیں تھی۔تم نے ہی تو مجھے اس کے لفظ بتائے ہیں۔ آج مجھے اپنی محبت کی کم مائیگی کا احساس ہوا ہے؟ میں کتنی کم ظرف ہوں اور وہ محبت کے اس بلند مقام پر کھڑا ہے جہاں تک میری نگاہ کی رسائی بھی نہیں ہے۔ میرے پاس تو محبت کا ایک ذرہ بھی نہیں ہے اور وہ قطرے میں دریا بہائے بیٹھا ہے...... مت دو مجھے کوئی سبق ،مجھے اب محبت کے محدود دائروں میں نہیں بھٹکنا۔آج ہی سے تو میرا سفر شروع ہوا ہے،جس کی کوئی منزل نہیں ہے۔"

"یہ تو زندگی کی نعمتوں کی ناشکری ہے تم اپنے وجود کی پکار کا جواب کیا دو گی۔ اس کا احساس ہے تمہیں۔"

نادیہ نے اسے احساس دلایا۔

"تم جانتی ہو کہ وجود اپنی حیثیت نہیں رکھتا ،یہ روح ہی اسے متحرک کئے ہوئے ہے۔ جب روح سرشار ہو جاتی ہے نا تو پھر وجود اپنی حیثیت کھو دیتا ہے۔ جسم اور روح کی تقسیم...... خیر......! میرے نئے سفر کی کوئی منزل نہیں تم مجھے اب کوئی نصیحت مت کرنا کیونکہ نصیحتوں کا وقت اب بیت چکا ہے۔"

صوفیہ نے اپنی چمکتی ہوئی آنکھوں ،پرسکون سانسوں اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کچھ ایسے کہا کہ نادیہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس کے سامنے بالکل نئی طرح کی صوفیہ تھی۔ اجنبی سی منفرد سی۔ نادیہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس نے یہ سب بتا کر اچھا کیا یا زندگی کی سب سے بڑی غلطی کر چکی ہے؟

☆☆☆

وہ خوشگوار ترین رات کا پہلا پہر تھا۔

محمود اپنے پاپا اور اپنی ماما کے ساتھ "خصوصی ڈنر" کے بعد ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا تھا اس رات کے کھانے کو خصوصی ڈنر کا نام اس کے پاپا نے دیا تھا جو اس کے ہاؤس جاب کے مکمل ہو جانے کی خوشی میں تھا۔وہ ان لمحوں کو جاوداں بنا لینے کی کوشش میں تھے۔ ڈنر کے بعد وہ فوری طور پر اپنے کمرے میں گئے اور اپنا بریف کیس اٹھا لائے۔ وہ دونوں ماں بیٹا کے پاس آکر بیٹھ گئے پھر جب بولے تو ان کے لہجے میں بلا کی سنجیدگی تھی۔

"دیکھو بیٹا......! اب تم اپنی زندگی کے سب سے اہم اور مشکل مرحلے میں داخل ہو رہے ہو ،دنیا داری جان جوکھم کا کام ہے۔تمہیں پتہ ہے کہ میں تمہیں ایک کامیاب نرنس مین کے روپ میں دیکھنے کا خواہش مند تھا۔لیکن......! تمہاری ماما نے تمہیں ڈاکٹر بنایا اور تم بن گئے۔ مجھے تمہاری کامیابی پر تمہاری ماما سے بھی زیادہ خوشی اس لیے ہے کہ تم کامیاب ہوئے۔ مجھے فخر ہے تم پر......! میری خواہش ہے کہ تم زندگی میں کامیاب ترین انسان کہلاؤ۔ مجھے تم پر اعتماد ہے۔ بیٹا......! انسانیت کی خدمت کرنا بہت بڑا اور اعلیٰ جذبہ ہے۔ مگر تم یہ خدمت اس وقت ہی کر پاؤ گے ،جب تمہارے پاس انسانیت کی خدمت کے لیئے قوت ہو گی۔" یہ کہہ کر پاپا نے اپنا بریف کیس اٹھایا اور اس میں سے ایک فائل نکال لی۔اس دوران ماما بالکل خاموش رہی۔پاپا نے فائل اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔"اس میں تمہارے ہسپتال کے لئے زمین کے کاغذات ہیں، یہ میری طرف سے تمہارے لئے تحفہ ہے۔"

محمود نے فائل پکڑ لی اور بڑے جذباتی لہجے میں بولا؛

''میں آپ کے جذبات سمجھ رہا ہوں پاپا، اور وہ بھی جو آپ مجھ سے کہنا چاہ رہے ہیں۔میں پوری کوشش کروں گا کہ آپ کی توقع پر پورا اتر سکوں۔''

''میرا سب کچھ تمہارا ہے بیٹے! اسے تم جس طرح چاہو خرچ کر سکتے ہو۔''

''تھینک یو پاپا، مجھے آپ پر فخر ہے۔'' محمود نے انتہائی پیار سے کہا اور اپنے باپ کے شانے سے لگ گیا۔وہ آہستہ آہستہ اسے تھپکنے لگے۔تب اس کی ماما نے مسکراتے ہوئے کہا؛

''اب آپ اسے اس لڑکی کے بارے میں بتا دیں جو اس کے لیئے ہم نے پسند کر لی ہے۔''

''بتا دیں یا ابھی اسے تجسس میں رکھیں؟''

اس کے پاپا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''چلیں بتا دیں۔''

اس کی ماما قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔

''بیگم تم ہی بتا دو۔''

پاپا نے خوش دلی سے کہا۔

''اچھا میں بتا دیتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہوئیں اور محمود کی طرف دیکھ کر بولیں ''ہم دونوں نے تمہارے لئے لڑکیاں دیکھی ہیں۔ پچھلے دنوں یہاں نادیہ بھی آئی تھی۔تمہارے پاپا کو پسند ہے مگر پھر پتہ چلا کہ اس کی منگنی ہو چکی ہے۔ خیر.....! ہم نے تمہارے لئے جس لڑکی کو پسند کیا ہے۔وہ ہے اپنی سحرش.....''

''سحرش.....!'' محمود نے حیرت سے کہا اور پھر مسکراتے ہوئے بولا'' ماما وہ اس کو بھی مذاق سمجھے گی اور عین ممکن ہے کہ جب وہ دلہن بنی ہوئی ہو اور میں دولہا تو وہ باراتیوں کے درمیان آکر کہے۔ کہو ڈاکٹر صاحب، کیسی رہی؟'' وہ بے تحاشا ہنس رہا تھا۔ پھر جیسے ہی اس کی نگاہ اپنے والدین کے سنجیدہ چہروں پر پڑی تو ہنستے ہوئے ایک دم خاموش ہو گیا اور پھر سنجیدگی سے بولا'' آپ لوگ اداس کیوں ہو گئے؟''

''اداس نہیں، اپنی غلط پسند کی وجہ سے ہمیں۔''

''اُو نو پاپا، ایسی بات نہیں۔ آپ کی پسند میرے لئے محترم ہے۔آپ نے ایسے کیوں سوچ لیا؟''

''نہیں بیٹا.....! ہم نے ان کے گھر والوں سے بات نہیں کی، یہ بات ابھی ہمارے درمیان میں ہے۔''

اس کی ماما نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''نہیں ماما، آپ کی پسند، میری پسند، میں تو یونہی مذاق کر رہا تھا چلیں، اب مسکرا دیں۔''

محمود نے کچھ اس انداز سے کہا کہ وہ مسکرا دیئے۔وہ دونوں باتیں کرنے لگے تو محمود سوچنے لگا سحرش کے سامنے یہ معاملہ آیا تو اس کا ردعمل کیا ہوگا؟ وہ کس طرح خیال کرے گی؟ اسی سوچ کو بڑھاوا ملا تو اسے سحرش منفرد سی لگی۔سحرش کا نیا روپ اس کے سامنے تھا۔تبھی چہرہ چھم سے اس کے خیالوں میں اتر آئی۔کتنا عرصہ ہو گیا تھا وہ اسے نہیں ملی تھی۔ اس کا ردعمل کیا ہوگا؟ شاید منفی شاید مثبت؟

تقریباً دو ہفتے کے بعد اس کے والدین باقاعدہ رشتہ لے کر سحرش کے ہاں گئے تھے۔ ابھی وہ لوگ وہیں تھے اور وہ ہسپتال میں تھا کہ سحرش کا فون آ گیا۔

''ڈاکٹر صاحب! آپ ہی ہیں نا؟''

اس کا لہجہ محمود کو عجیب سا لگا۔

''ہاں، میں ہی ہوں، تم اتنا گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟''

اس نے پوچھا

''میں.....میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔''

اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''پابندی تھوڑی ہے جو تم یوں اجازتیں طلب کر رہی ہو۔ آجاؤ گھر۔''

اس نے بے خیالی میں کہہ دیا۔

''نہیں..... دراصل یہ معاملہ..... وہ..... خیر..... آپ کسی اور جگہ کے بارے میں بتائیں، میں آپ سے اکیلے میں بات کرنا چاہتی ہوں۔''

سحرش کی جھجک ختم نہیں ہوئی تھی۔

"او بابا......" اس کے ذہن میں آیا تو وہ مسکرا دیا۔تبھی اس نے ایک ریسٹوران کا نام بتایا۔"میں وہاں آجاؤں گا تم بھی آجاؤ۔" پھر وقت کا تعین کر کے فون رکھ دیا۔

محمود وقت پر پہنچ گیا۔اس نے دیکھا کہ سحرش مضطرب سی اس کے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ مسکراتا ہوا اس کے پاس جا بیٹھا۔

"جی سحرش۔ایسی کیا افتاد پڑگئی۔" اس کے یوں کہنے پر وہ گڑ بڑا گئی۔ تبھی ویٹران کے پاس آیا تو محمود نے سحرش سے کھانے کے بارے میں پوچھا۔اس دوران وہ خود پر قابو پا چکی تھی۔اپنی پسند بتا کر وہ خاموش ہوگئی۔ویٹر چلا گیا تو اس نے پھر پوچھا

"ہاں، کہو، کیا کہنا ہے؟"

" آپ کے پاپا اور ماما...... میرا مطلب ہے ،انہوں نے......"

وہ کہتے کہتے رک گئی۔

"ہاں ہاں ،انہوں نے کیا کیا......؟"

محمود نے اس کی حالت سے لطف لیتے ہوئے کہا۔

"انہوں نے آپ کے لئے مجھے مانگا ہے۔"

وہ تیزی سے ایک دم رک گئی اور شرما کر سر جھکا لیا۔

"تو اس میں اتنی پریشانی کی بات کیا ہے !" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔"ہاں، انہوں نے مجھے اپنے اس فیصلے کے بارے میں بتایا تھا اور ان کا فیصلہ سرآنکھوں پر۔"

میری بات نہیں سمجھ رہے آپ۔"اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا؛"میرا مطلب ہے کوئی پسند نہیں تھی یا یہ فیصلہ آپ نے زبردستی......"

"سحرش تم نجانے کیا سوچ رہی ہو...... میری کوئی پسند نہیں اور میری شادی کے بارے میں فیصلہ کرنے کا حق صرف اور صرف میرے والدین کو ہے۔"

یہ کہتے ہوئے اس کے ذہن میں سرسراہٹ ہوئی، ایک خیال بڑے سبک انداز میں اس کے ذہن میں گونج گیا، تب اس نے بڑے سلیقے سے پوچھا؛

" سحرش ٹھیک ہے ہم دونوں کے درمیان کزن ہونے کا رشتہ تو ہے ہی مگر ہم اچھے دوست بھی ہیں۔ میں بڑے خلوص اور اعتماد سے پوچھ رہا ہوں کہ تمہیں اگر اس فیصلے پر اعتراض ہے تو بلا جھجک کہہ دو۔"

"ایسی بات نہیں ہے۔"

اس نے اضطراب سے کہا۔

"ایسا ہو سکتا ہے، تمہاری کوئی پسند ہو سکتی ہے، تمہارا اپنا معیار ہوگا۔یقین جانوں پورے خلوص سے تمہاری مدد کروں گا۔"

"ایسا نہیں ہے...... بالکل بھی نہیں...... بلکہ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ ایسا ممکن ہوسکتا ہے۔میں خود کو اس قابل نہیں پا رہی ہوں۔"

اس نے پوری سچائی سے کہہ دیا۔

"ڈونٹ وری...... یہ فیصلہ ہمارا نہیں، ہمارے والدین کا ہے،وہ بہتر سمجھتے ہیں کہ تم کس قابل ہو۔"

اس نے کہا تو سحرش خاموش ہو گئی اس دوران ویٹر نے ان کے سامنے کھانا چن دیا۔

وہ دونوں بے دلی سے کھاتے رہے، اچانک سحرش نے پوچھا؛

"جس طرح آپ نے مجھ سے پوچھا کہ میری کوئی پسند یا کوئی معیار ہوسکتا ہے۔آپ نے بھی تو اس بارے ضرور سوچا ہوگا، یا کوئی......"

اس نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑدیا۔

"ایسا نہیں ہے اور تم جانتی ہو کہ میں اس پوزیشن میں ہوں کہ اپنی پسند کے بارے میں اظہار کرسکتا ہوں۔"

"چلیں آپ نہیں، لیکن کوئی آپ سے بہت محبت کرتا ہو،عشق کی حد تک تو......!"

"یار، مجھ سے بہت سارے لوگ پیار کرتے ہیں۔ محبت تو انسانیت کی بنیاد ہے، بس محبت کے روپ مختلف ہوتے ہیں۔"

"میرا مطلب کوئی لڑکی آپ سے......" سحرش نے پھر ادھوری بات کہی تو محمود نے چونک کر پوچھا۔

"میں اسے تمہارا وہم سمجھوں یا خدشہ؟"

"اگر حقیقت میں ایسا ہوا تو پھر......؟"

"تو پھر مجھے کوئی غرض نہیں۔ جس طرح کسی کو مجھ سے محبت کرنے کا حق ہے اور وہ محض اپنی مرضی سے کر رہا تو مجھے بھی یہ حق ہونا چاہئے کہ میں اپنی مرضی کروں یہ کوئی زبردستی تھوڑی ہے۔"

"او کے، میں سمجھ گئی۔"

اس کے چہرے پر رونق عود کر آئی۔

"کیا سمجھ گئی ہو، کچھ مجھے بھی سمجھاؤ۔"

محمود نے اس کی طرف دیکھ کر شوخی سے کہا۔

"یہ آپ کے سمجھنے کی بات نہیں، آپ سکون سے کھانا کھائیں۔"

محمود نے محسوس کیا کہ یہ بات کہتے ہوئے اس میں وہ فطری الہڑ پن اتر آیا ہے جس کے باعث وہ سبھی کو اچھی لگا کرتی تھی، تب اس نے پہلی بار غور سے سحرش کو دیکھا، گول چہرے پر بڑی بڑی آنکھیں، جس پر لمبی پلکیں اسے خمار آلود بنا رہی تھیں۔ منا سا تیکھا ناک، پتلے ہونٹ جن سے رس ٹپکتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ قدرے گھنگریالے گھنے بال، بھرا بھرا جسم اور گلابی رنگ۔ اس کے یوں دیکھنے پر وہ شرماتے ہوئی بولی۔

"میں نے کہا ہے کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"

"ٹھنڈا کر کے ہی تو کھاتے ہیں۔"

محمود نے کہا تو وہ موضوع بدلتے ہوئے بولی۔

"ڈاکٹر شاعر یا شاعر ڈاکٹر صاحب، آپ کا مجموعہ کلام کب آ رہا ہے۔"

"بہت جلد......" اس نے کہا تو بات شاعری سے ادب اور پھر رشتے ناطوں تک آ پہنچی۔ وہ کھانا ختم کر کے اٹھے اور ریستوران سے باہر آ گئے۔ اس وقت دونوں کے ذہن میں کوئی الجھاؤ نہیں تھا۔

☆☆☆

نادیہ کی شادی ہوگئی تو صوفیہ کی زندگی میں تنہائی اتر آئی۔

وہ جو قربت انہیں میسر تھی ختم ہو کر رہ گئی۔ حالانکہ چند گلیاں پار کرتے ہی نادیہ کا سسرال تھا۔ لیکن پہلے والے حالات ہی نہیں رہے تھے۔ پوری دنیا میں ایک نادیہ ہی تو تھی جو اس کی رازداں ہونے کے ساتھ اس کو سمجھتی تھی۔ وہی اس کی مزاج شناس اور وہی رمز آشنا تھی۔ نادیہ نئے ماحول میں کیا گئی، خود کو گم کر بیٹھی۔ صوفیہ نے ان حالات سے سمجھوتہ کر لیا اور خود کو محدود کرتے ہوئے کتابوں کی دنیا میں کھو گئی۔ وقت کا احساس جیسے ختم ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ کالج میں بھرپور وقت گزارتی۔ بہت ساری طالبات اس کے ارد گرد ہوتیں۔ تنہائی، کتابوں کی رفاقت اور محبت کے اثر نے اس کی باتوں میں خوشبو بھر دی تھیں۔ جب کوئی دوسرا سنتا تو اس کے خیالوں سے مہک مہک جاتا۔ وہ اپنی پوری شخصیت میں تبدیل ہو کر رہ گئی تھی۔ کالج سے واپس آتی تو زیادہ تر وقت اپنے کمرے میں یا پھر نت نئے کھانے بنانے میں مصروف رہتی۔ اس نے سحرش اور محمود کی منگنی ہو جانے کی خبر نہایت اطمینان سے سنی تھی۔ اس نے دل کی گہرائیوں تک، خود کو ٹٹول کر دیکھا، کہیں بھی ایک ذرا سا بھی کھو دینے کا احساس نہیں تھا۔ نادیہ جب بھی اسے ملتی، اس کے اطمینان اور پرسکون کیفیت پر مضطرب ہو کر رہ جاتی۔ کوئی سوال کرنے کی اس میں ہمت ہی نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ صوفیہ انتہائی حساسیت کے دورے گزر رہی ہے، جہاں بندہ اپنے من میں ڈوب گیا ہوتا ہے۔ اس دن بھی وہ کتاب میں کھوئی ہوئی تھی جب نادیہ اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے گردن گھما کر دیکھا تو خوشی کا اظہار اس کے چہرے پر پھیل گیا۔ نادیہ اس کی طرف دیکھتی ہی رہ گئی۔ ٹیبل لیمپ کی روشنی میں اس

کا چہرہ کسی چمکتے ہوئے نئے زیور کی طرح لگ رہا تھا۔ ایک مارواڑی سانکھار تھا اس کے چہرے پر، جو اس دنیا کا لگتا ہی نہیں تھا۔

"آؤ نادیہ......! بڑے دنوں بعد تمہیں وقت ملا ہے"۔ صوفیہ نے دھیرے سے کہا تو وہ چونکی پھر اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولی؛

"شاید آج بھی نہ آ پاتی مگر تمہاری امانت دینے آئی ہوں" نادیہ نے اپنا پرس کھولتے ہوئے کہا۔

"یہ کیا ہے۔" وہ قدرے تجسس سے بولی۔

"ڈاکٹر محمود کا مجموعہ کلام......! سحرش نے دو کاپیاں بھجوائی ہیں، یہ ایک تمہارے لئے ہے۔"

اس نے صوفیہ کو کتاب تھماتے ہوئے کہا اس نے کتاب پکڑ کر سرورق دیکھا۔

"ہوائیں ظلم کرتی ہیں، مجموعہ کا عنوان۔" اس نے زیر لب دہرایا پھر نادیہ سے مخاطب ہو کر بولی؛ "نام تو اچھا ہے اور آرٹسٹ نے سرورق پر اس کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ پرانے قلعے کے گرے ہوئے برج، جس گیلی سڑک پر پڑے ہوئے ہیں وہیں تازہ پتوں سمیت ٹوٹی ہوئی شاخیں اور دیکھو رنگوں کا انتخاب بھی کتنا من موہنا ہے۔ نگاہوں کو اچھا لگ رہا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے کتاب کے پس ورق کو دیکھا جہاں ڈاکٹر محمود کے بارے میں لکھا ہوا تھا وہ پڑھنے کے بعد اس نے کتاب کھولی، انتساب دیکھا؛ "چہرہ کے نام......! جو میری شاعری کا مخاطب ہے۔" یہ پڑھ کر وہ زیر لب مسکرا دی۔ چند لمحے یونہی گزر گئے تو اس نے کتاب ایک طرف رکھتے ہوئے کہا؛

"اطمینان سے پڑھوں گی بہت ساری شاعری تو پہلے ہی سے پڑھی ہوئی ہے۔ فی الحال تمہیں اس کی تازہ غزل دکھاتی ہوں۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے میز پر رکھا ہوا ادبی رسالہ اٹھایا اور نادیہ کو دے دیا، پھر صفحہ نمبر بتاتے ہوئے بولی "پڑھو اور مجھے بھی سناؤ۔"

نادیہ نے مطلوبہ صفحہ نکالا اور دھیرے دھیرے پڑھنے لگی۔

ادھورے خوابوں کے خستہ کاغذ، سنبھال رکھنا، حساب ہوگا
وفا کے رشتے جفا کی رت میں، بحال رکھنا، حساب ہوگا

سنہرے جذبوں کی قدر کرنا، رفاقتوں میں وقار رکھنا
اندھیر نگری میں دل جلا کے، خیال رکھنا، حساب ہوگا
محبتوں کے سفیر بن کر، جو چاہتوں کے، نقیب بننا
راہ وفا میں، نہ تم کسی سے، ملال رکھنا، حساب ہوگا
زمانے بھر کی یہ تلخیاں کیوں، یہ جبر کیسا، یہ صبر کیوں کر
میرے لئے تم بس اپنے لب پہ سوال رکھنا حساب ہوگا
خزاں کے موسم اُتر بھی آئیں، فضائیں جھلسا بھی دیں مری جاں
تم اپنی سوچوں کے منظروں میں جمال رکھنا حساب ہوگا

نادیہ ایک دم چھلک پڑی۔ اس نے بڑے ضبط سے اپنے اندر اٹھنے والے طوفان کو چھپایا۔ اس وقت اس کا جی چاہ رہا تھا کہ سامنے محمود ہو اور وہ پوری شدت سے جھنجوڑ کر کہے کہ تم ایسا کیوں لکھتے ہو، جس سے کسی کے زخم، بجائے سلنے کے اور بھی رسنے لگیں۔ کیسے مسیحا ہو تم؟ اس نے آنکھیں بند کر کے کرب کی اس کیفیت پر قابو پایا اور صوفیہ کے چہرے پر دیکھا، جہاں سکون کی تہہ تھی اور وہ اس کی طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ نگاہیں چار ہوتے ہی صوفیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"نادیہ، کوئی تبصرہ تو کرو اس پر......تم تو......"

تب نادیہ تڑپ کر بولی؛

"نہیں، کچھ بھی تو نہ کہہ سکوں گی...... مگر تم کب سے اذیت پسند ہو گئی ہو۔"

"میں......!" صوفیہ نے سکون سے کہا اور پھر مسکراتے ہوئے بولی" نہیں ایسا نہیں سوچتے، یہ منفی نکتہ نظر ہے۔ مثبت سوچ یہ ہے کہ یہ میری روح کی بالیدگی میں کس قدر اہم ہے چلو چھوڑو ہم کچھ اور باتیں کرتے ہیں۔"

اس نے رسالہ پکڑ کر دوبارہ میز پر رکھ دیا اور باتوں کا موضوع بدل دیا۔

☆☆☆

محمود کی شادی دھوم دھام سے ہو گئی

اس کے دوستوں اور رشتہ داروں میں کوئی ایسا نہیں تھا جو اس کی شادی میں نہ آیا ہو۔ سوائے نادیہ اور صوفیہ کے۔ یقیناً وہ بھی شامل ہوتیں اگر نادیہ اس مرحلہ میں نہ ہوتی جب عورت ذات تخلیقی عمل کے آخیر میں ہوتی ہے۔ زمانے بھر میں وہ صوفیہ کو اپنے پاس دیکھنا چاہتی تھی۔ سو وہ بھی اسی باعث نہ آسکی۔ انہوں نے سحرش کے لئے ڈھیروں دعائیں اور تحائف بھجوائے تھے۔ سب لوگ سحرش کی قسمت پر رشک کر رہے تھے۔ شادی کے تیسرے دن وہ ہنی مون کے لئے ایبٹ آباد چلے گئے۔ وہاں اس کے پاپا کے دوست لطیف انور بڑے سارے بنگلے میں اپنے نوکروں کے ساتھ رہتے تھے۔ اس شخص کے دو ہی شوق تھے۔ کتابیں پڑھنا اور لوگوں سے ملنا...... لطیف انور نے پہلے دن اپنے گھر پر ان کا استقبال کیا اور پھر انہیں اپنے ملازموں کے سپرد کر کے اپنے آبائی شہر چلے گئے۔ اتنے بڑے بنگلے میں وہ بڑے سکون سے رہے۔ محمود نے محسوس کیا کہ زندگی بالکل بدل گئی ہے۔ قدرت کے حسین نظاروں کے درمیان مدہوش کر دینے والے موسم میں سحرش کا ساتھ اب اسے ایک نئی دنیا میں لے گیا تھا۔ اس دوران چہرہ ایک بار بھی اس کے پاس نہیں آئی۔ آخری بار اس کی شادی سے دو دن قبل آئی تھی اور بہت خوش تھی اس دن اس نے ہلکے پیازی رنگ کا شلوار سوٹ پہنا ہوا تھا۔ ڈھیر سارا وقت اس کے پاس بیٹھی رہی اور اس کا بیڈ روم اس کی مہک سے بھر گیا تھا۔ پھر اس کے بعد وہ نہیں آئی۔

ایسے ہی ایک دن وہ لان میں بیٹھا ہوا تھا، سحرش اندر اپنے کاموں میں مصروف تھی۔ اس کا دھیان چہرہ کی طرف چلا گیا تھا کہ وہ کیوں نہیں آئی، ناراض ہو گئی

ہے۔ یہ سوچتے ہوئے اس کے ذہن میں ڈاکٹر شیرازی کے الفاظ گونجنے لگے۔

"بیٹا! یہ محبت نہیں، تمہارا واہمہ ہے۔ خیالوں کی محبت دیوانگی کی طرف اٹھتے ہوئے قدم ہیں اور یہ دیوانگی خود کو ضائع کر دینے کے مترادف ہے۔ تمہارا وجود مجسم ہے، ایک حقیقت ہے۔ تمہار چہرہ شادی کے بعد محض ایک خوبصورت یاد کے سوا کچھ بھی نہیں رہے گا۔"

کہیں یہ بات سچ تو نہیں؟ یہ سوچ دھوئیں کی طرح پھیلتی گئی جس نے اس کے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ چہرے کے بارے میں یہ پہلی چنگاری تھی جو اس کے وجود کے اندر سلگ اٹھی تھی۔ اس کے بعد وہ تقریباً دس پندرہ دن تک وہیں رہا مگر اس دوران چہرہ سے اس کی ملاقات نہ ہو پائی اور یہ ملاقات نہ ہونا اس کے لئے سوال چھوڑ گیا کہ ڈاکٹر شیرازی کی تشخیص صحیح تھی اور اس کا خیال غلط؟...... وہ واپس اپنے شہر اس سوال کی بے نام سی چبھن لے کر آیا۔ واپس آتے ہی یہ چبھن قدرے اس کی مصروفیت کے باعث کم تو ہوئی لیکن ختم نہ ہو سکی۔ نئی ذمہ داریاں، ہسپتال کی تعمیر، لوگوں سے میل ملاقات، اس کی زندگی تیز تر ہو گئی تھی۔ شاعری ایک قصہ پارینہ بن کر رہ گئی۔ کبھی کبھار کوئی شعر موزوں ہو جاتا تو کسی کاغذ پر منتقل ہو کر ادھر ادھر کہیں کونے کھدرے میں گم ہو جاتا۔ وقت گزرتا رہا اور وہ دھیرے دھیرے مصروفیت کے جال میں الجھتا چلا گیا۔ اس کی تمام تر توجہ کا مرکز اس کا ہسپتال بن کر رہ گیا تھا۔ اس شام اسے ایک ڈنر میں جانا تھا۔ جو اس کے ایک سینئر ڈاکٹر نے دیا تھا۔ وہ ڈنر اس وجہ سے اہم تھا کہ شہر کے معزز ترین افراد کے علاوہ اپنے اپنے شعبے سے متعلق مشہور ڈاکٹر بھی آنے والے تھے۔ یہ اس کی اپنی شخصیت اور لوگوں سے تعلق کا اثر تھا، جس کے بل بوتے پر اسے اس پارٹی میں بلوایا گیا تھا۔ ورنہ عام یا جونیئر قسم کے ڈاکٹر اس پارٹی میں شمولیت کا محض سوچ ہی سکتے تھے۔ اس نے سوچا تھا کہ اس کا ڈیوٹی ٹائم ختم ہونے کے بعد اتنا وقت ہوگا کہ وہ تیار ہو کر پارٹی میں پہنچ سکے۔ ڈیوٹی ٹائم ختم ہوا تو اس نے اپنا کوٹ اٹھایا اور چل دیا۔ وہ اپنے کمرے سے نکل کر باہر آیا تو راہداری میں نرس نے بتایا کہ ایک مریض بہت نازک حالت میں ہے، آپ اسے دیکھ لیں اس مریض کو خون کی قے آئی تھی۔ اسے بہت کوفت ہوئی کہ اسی وقت اس مریض نے آنا تھا۔ اسے کبھی مریض پر غصہ آتا اور کبھی اس کے بعد آنے

والے ڈاکٹر پر کہ وہ ابھی تک پہنچا کیوں نہیں؟ اس نے خود پر جبر کر کے اس مریض کو دیکھا، بے دلی سے اس کے لئے دوائیاں تجویز کیں اور واپس اپنے کمرے میں آگیا۔
اس کا فرض بنتا تھا کہ مریض کی حالت سنبھلنے تک وہیں رہے لیکن چونکہ اس کا ڈیوٹی ٹائم ختم ہو چکا تھا اور اسے پارٹی میں جانا تھا، اس لئے وہاں سے نکل پڑا۔ پارکنگ سے گاڑی لی اور گھر آگیا۔ جہاں وہ بڑے اطمینان سے تیار ہوا اور اس پارٹی میں جا پہنچا۔ پارٹی اس کی توقع سے زیادہ ہنگامہ خیز تھی۔ یہاں بھی رنگوں، روشنیوں، خوشبوؤں کے علاوہ چہروں کی فسوں کاریاں پورے جوبن پر تھیں لیکن اس کی دلچسپی ان چہروں میں نہیں تھی بلکہ وہ اپنے پیشے میں آگے چلے گئے لوگوں سے ملنا چاہتا تھا۔ وہ مختلف لوگوں سے ملتا رہا۔ وہ چند لوگوں کے درمیان کھڑا پورے انہماک سے ایک شخص کی بات سن رہا تھا کہ اچانک اس نے خود سے چند قدم کے فاصلے پر چہرہ کو دیکھا جو تیز روشنی میں اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے اپنا وہم سمجھتے ہوئے سر جھٹک دیا۔ تبھی چہرہ نے اسے نام لے کر پکارا۔ کوئی بھی متوجہ نہیں ہوا، صرف اس نے ہی آواز سنی۔ وہ غیر محسوس انداز سے ان لوگوں کے درمیان سے نکل کر چہرہ کے پاس چلا گیا۔ اس کے چہرے پہ بلا کی اداسی تھی جیسے اس کا خون نچوڑ لیا گیا ہو۔

"چہرہ! تم اتنے دنوں بعد، اچانک یہاں......؟"

"شاید میں نہ آتی لیکن تم بہت سنگدل ہوتے جا رہے ہو......"

"میں سنگ دل...... کیا بات ہے، چہرہ......؟"

"تم ایک تڑپتے مریض کو محض اس پارٹی کی خاطر چھوڑ کر آگئے ہو، مجھے تم سے یہ توقع نہیں تھی...... تمہاری زندگی ہے تو اس سے بھی بڑی اور اہم پارٹیاں تمہیں مل جائیں گی لیکن اگر وہ مریض تمہاری لاپرواہی سے مر گیا تو پوری زندگی سکون نہیں پاسکو گے۔"

"میں اپنی ڈیوٹی مکمل کر کے آیا ہوں......؟"

اس نے جواز پیش کیا۔

"نہیں، تم اس سے غفلت برت کر آئے ہو۔ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہو کیا ایسا نہیں ہے۔ تمہیں اس کے آنے سے کوفت نہیں ہوئی تھی؟"

"تم کیا چاہتی ہو......؟"

اس نے گویا ہتھیار ڈال دیئے۔

"یہی کہ اب جاؤ اس مریض کی دیکھ بھال کرو جو تڑپ رہا ہے ورنہ تم بھی سکون نہیں پاسکو گے۔"

یہ کہہ کر وہ پلٹی اور چند قدموں کے بعد فضا میں تحلیل ہوگئی۔ محمود کے لئے کئی سوال اُمنڈ آئے۔ کیا ڈاکٹر شیرازی کی تشخیص غلط تھی، چہرہ کو کیسے پتہ چلا کہ میں اس مریض کو لاپرواہی سے چھوڑ آیا ہوں اور وہ کیوں چاہتی ہے کہ میں لاپرواہی نہ کروں اور یہ پارٹی چھوڑ کر اس عام مریض کی دیکھ بھال کروں؟...... وہ چند لمحے سوچتا رہا اور فیصلہ نہ کر سکا کہ وہ پہلے کس سوال پر سوچے۔ اس نے ساری سوچوں کو جھٹکا اور گاڑی لے کر تیزی سے ہسپتال پہنچا۔ اسے یہ سن کر سخت افسوس ہوا کہ دوسرا ڈاکٹر نہیں پہنچا اور مریض تڑپ رہا ہے، خلاف توقع اسے دیکھ کر سارا اسٹاف حیران رہ گیا تھا۔
مریض ایک دفعہ پھر سے خون کی قے کر چکا تھا۔ محمود نے دل ہی دل میں اللہ سے مدد چاہی اور پورے خلوص سے اس مریض پر جھک گیا...... وہ ساری رات اس کی دیکھ بھال کرتا رہا۔ اس دوران اس نے گھر فون کر کے ماما کو بتا دیا کہ وہ نہیں آسکے گا۔ صبح نور کے تڑکے اس مریض کی حالت سنبھل گئی تو وہ وہیں کاؤچ پر لیٹ گیا۔ اس کے دل میں سکون ہی سکون پھیل گیا۔ تب اس کی سمجھ میں آیا کہ چہرہ نے اسے کیوں اس مریض کی دیکھ بھال کو بھیجا تھا۔ اسے نیند نہیں آئی بلکہ اس کے ذہن میں کئی سوال گونجتے رہے جن کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا...... اگلے دو دنوں تک مریض کی حالت بہتر ہوگئی، اس حد تک کہ اس میں تندرستی کے آثار پیدا ہو گئے۔ محمود نے اپنی پوری توجہ اس پر لگا دی تھی۔ سٹاف حیران تھا وہ صرف اس مریض پر اتنی توجہ کیوں دے رہا ہے۔ بہت سارے لوگوں کی نگاہوں میں اس کی عزت بڑھ گئی۔

پھر کئی بار ایسا ہوا۔ اُسے اس تیز طرار زندگی کی ان ساری دلچسپیوں سے بھی لطف اندوز ہونا چاہئے تھا، جو اس کے اردگرد پھیلی ہوئی تھیں لیکن چہرہ اسے دکھی انسانیت سے الگ نہیں ہونے دیتا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ جیسے وہ پابند ہوگیا ہو یا جکڑ لیا گیا ہو، چہرہ فقط پہلے رومانی باتیں کرتا تھا، نئے نئے جذبوں سے متعارف کروانے کا

باعث بنتی تھی، اب اس کے ساتھ کوئی رومانی احساس جڑا ہوا نہیں ہوتا تھا۔ اس کا آنا کبھی کبھار ہوتا اور ایسا اسی وقت ہی ہوتا جب وہ کسی مریض سے لاپرواہی برت جاتا۔ اب چہرہ کا لہجہ سرزنش بھرا ہوتا۔ پہلے پہلے محمود اس معاملے کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا مگر اسے سمجھ نہیں آیا۔ وہ جتنا سوچتا اتنا ہی الجھ جاتا۔ پھر جب یہ الجھاؤ جھنجلاہٹ میں بدل گئی تو اسے لگا جیسے چہرہ اس کے لئے ایک بوجھ بن گئی ہو، کئی بار اس نے اپنی اس سوچ کے بارے سوچا۔ وہ خود پوری طرح اس معاملے میں، اس خدمت گزاری میں مخلص نہیں تھا۔ بس ایک چہرہ تھی جو اسے مجبور کر دیتی تھی جبکہ اس کے نتیجہ میں لوگ اسے اپنے پیشے سے مخلص اور دیانتدار ڈاکٹر سمجھ رہے تھے۔ وہ لوگوں کی ان باتوں کو دیکھتا اور اپنے آپ کو پرکھتا تو اسے سب منافقت میں لتھڑا ہوا نظر آتا اور الجھ جاتا۔ اس کے اندر انتشار کی چنگاری آگری تھی جو گزرتے وقت کی ہواؤں سے سلگنا شروع ہو گئی تھی۔..... وہ ایک خوبصورت بیٹے کا باپ بن گیا تھا۔ اس نے بڑے پیار سے اس کا نام جنید رکھا تھا، وہ اپنے دل میں اپنے بیٹے کے لئے پیار کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر رکھتا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کے ساتھ کھیلنے، اسے گود میں اٹھانے کی زبردست خواہش رکھتا تھا لیکن یہ کبھی کبھار ہی ہو پاتا۔ در اصل محمود کے اردگرد محبتیں تھیں۔ جن کے مختلف انداز اس کی توجہ چاہتے تھے۔ اس کی ماں، اپنے اس بیٹے کو ڈھونڈا کرتی جو زیادہ وقت اس کی ممتا کی چھاؤں میں گزارا کرتا تھا، اب وہ ایک چھت تلے رہتے ہوئے بہت کم وقت کے لئے اس کا چہرہ دیکھ پاتی۔ وہ سمجھتی تھی کہ اس کا بیٹا اس دنیا کی گہما گہمی میں شامل ہو گیا ہے، جہاں بندہ اپنے آپ کو کھو دیتا ہے۔ اس کی بیوی سحرش بھرپور توجہ چاہتی تھی۔ وہی توجہ شادی کے ابتدائی دنوں میں اسے محمود سے حاصل تھی۔ اسے محمود پر پورا اعتماد تھا لیکن اس کی بے اعتنائی وہ برداشت نہیں کر پا رہی تھی۔ وہ خود پر صبر کئے رہی، اپنے آپ کو اپنے بیٹے میں گم کر کے اس احساس سے چھٹکارا پانے کی ازحد کوشش کرتی رہی لیکن اپنے وجود سے اس احساس کو ختم نہ کر سکی۔ اور چہرہ! جس کی محبت میں وہ کھو گیا تھا، بالکل اک نئی صورت میں اس کے سامنے تھی۔ اس کا باپ جو اس سے زیادہ ہسپتال کی تعمیر میں دلچسپی لے رہا تھا۔ اسے معلوم تھا وہ اسے کاروباری نظر سے دیکھ رہے تھے۔ مگر اس کے تناظر میں جبکہ چہرہ اسے انسان و انسانیت سے محبت کا درس دیتی ہے، وہ بزنس کبھی نہیں کر سکے گا۔ یہی سوچ اسے

مزید پریشان کر دیتی۔ محمود نے ان محبتوں میں خود کو ٹوٹتا ہوا محسوس کیا اور یہ کیسی عجیب سی بات ہے کہ جب انسان ٹوٹتا ہے تو کربِ مسلسل اسے عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے۔

ایک دن وہ جلدی گھر آ گیا۔ اس کے ماما اور پاپا کہیں گئے تھے اور جنید پوری شدت سے رو رہا تھا۔ وہ سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا جہاں پریشان سحرش اسے چپ کرانے میں بے حال ہو رہی تھی۔

"کیا ہوا اسے.....؟" محمود نے پوچھا۔

"پتہ نہیں، کافی دیر سے رو رہا ہے....."

"لاؤ، اسے دیکھوں....."

اس نے جنید کو پکڑا اور اپنی گود میں ڈال کر دیکھنے لگا۔ اسے احساس ہوا کہ بچے کو بخار ہے۔ کافی دیر تک چیک کرنے کے بعد اسے یقین ہو گیا تو محمود کو پہلی بار سحرش پر غصہ آ گیا۔

"کیسی ماں ہو تم! تمہیں یہ بھی نہیں پتہ نہیں کہ بچے کو بخار ہے.....؟"

اس کے لہجے میں دھیما پن ہونے کے باوجود کچھ ایسا تھا کہ سحرش تقریباً چیخ پڑی۔

"کیسے باپ ہو تم! جسے اولاد کا احساس نہیں ہے۔"

"سحرش! تم.....؟"

اس نے انتہائی حیرانگی سے دیکھا اور چند لمحوں تک اسی حیرانگی سے ساکت رہا۔

"ہاں میں، ڈاکٹر محمود میں! مجھ سے، آپ اپنی ماں سے لاپرواہی برتیں، ہم برداشت کر لیں گے لیکن اپنی اولاد سے لاپرواہی میں قطعاً برداشت نہیں کر سکتی....."

محمود کے سامنے بالکل نئی سحرش تھی، اس کی آنکھوں میں نجانے کون کون سے جذبے چیخ چیخ کر اپنا اظہار کر رہے تھے۔ وہ چپ رہا، پھر اٹھ کر اس نے جنید کے لیے دوائیاں دیکھیں اور اسے پلانے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ باتھ روم میں سے تازہ دم ہو کر واپس آ چکا تھا، وہ چپ چاپ اس کے پاس بیٹھ گیا۔

"کھانا لگاؤں آپ کے لیے.....؟"

سحرش نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

"تم نے کھایا......؟"

"نہیں...... آپ کا انتظار کر رہی تھی۔"

"چلو، پھر جلدی کرو۔ صابراں سے کہو، وہ کھانا لگائے۔"

محمود نے کرسی سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

وہ کھانا کھا کر جنید کے پہلو میں آ کر لیٹ گیا۔ وہ خاموش تھا لیکن ذہن میں طوفان اٹھا ہوا تھا۔ سحرش کے اس نئے روپ نے اسے پوری جان سے لرزا کر رکھ دیا تھا۔ اس دن اسے احساس ہوا کہ وہ زندگی کے سب سے مشکل امتحان میں پڑ چکا تھا۔ سحرش بھی جنید کے دوسری طرف آ کر لیٹ گئی۔ کتنی ہی دیر تک وہ اپنی جگہ پر چپ رہی، پھر بولی؛

"سوری، محمود! میں ذہنی دباؤ میں آ کر آپ سے غلط بول گئی۔ معاف کر دیں مجھے......"

اس نے سحرش کی طرف دیکھا اور پھر مسکراتے ہوئے بولا۔

"تم نے کچھ غلط نہیں کہا اور یقین جانو سحرش، میں بھی غلط نہیں ہوں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ زندگی میں حالات کی ہوائیں یوں بھی ہو جائیں گی۔"

"مجھے بتائیں، محمود! آخر یہ کیسے حالات ہیں؟ میں آپ کی بیوی بعد میں ہوں، آپ کی دوست پہلے ہوں۔ مجھ سے اپنے مسائل میں حصہ دار بنائیں، شاید میں کچھ کر سکوں......؟"

"ایسا کیوں سوچتی ہو تم......؟"

"ایک حقیقت ایسی ہے جس سے میں آگاہ ہوں اور جس کی بابت مجھے بہت پہلے آپ سے بات کر لینا چاہیے تھی۔ میں سمجھتی ہوں، یہ سب اسی باعث ہے......"

سحرش آج کچھ بھی دل میں نہ رکھنے پر آمادہ تھی۔

"کیا ہے وہ حقیقت......؟"

محمود نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

"دیکھیں، میں کہہ تو دوں مگر خدارا مجھے غلط مت جانیے گا۔ آپ کا ردعمل جو

بھی ہوگا مگر میرے ذہن کی خلش مٹ جائے گی۔"

"بولو......"

محمود نے کہا۔

سحرش تذبذب کے سے لہجے میں کافی دیر بعد بولی۔

"آپ نے کسی سے محبت کی ہے، میرا مطلب شادی سے قبل آپ کسی کو چاہتے تھے جس کا اظہار آپ نے کبھی کیا؟"

اس کے اس طرح کہنے پر وہ سوچ میں پڑ گیا۔ شادی سے قبل سحرش نے اور اس سے بھی پہلے نادیہ نے ایسی ہی بات اس سے کہی تھی۔

"کھل کر کہو، کیا کہنا چاہتی ہو۔ میں پوری ایمانداری سے اس کا جواب دوں گا۔"

"آپ صوفیہ کے بارے میں کیا خیال کرتے ہیں، وہ کیسی لڑکی ہے؟"

سحرش نے کہہ ہی ڈالا۔

"انتہائی مغرور، نک چڑھی اور بدتمیز، جسے یہ تک احساس نہیں کہ تعلق اور رشتہ کیا ہوتا ہے؟"

"آپ اسی باعث اس سے اپنے پیار کا اظہار نہیں کر سکے؟"

"اُو، سحرش! یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ اظہار محبت تو تب ہوتا اگر اس کے لیے میں کوئی پیار بھرا جذبہ رکھتا۔"

"وہ تو آپ سے جنون کی حد تک محبت کرتی ہے......"

"سحرش! ایسا کیسے ممکن ہے۔؟"

وہ شدت حیرت سے گڑبڑا گیا تو سحرش چونک گئی۔ پھر دھیرے دھیرے سب بتاتی چلی گئی۔

"میں شاید اس کی شدتوں کو نہیں سمجھ سکتی لیکن اس کا احساس ضرور رکھتی ہوں اور یہ سب مجھے نادیہ نے بتایا۔"

سحرش نے آخر میں وضاحت کر دی۔

"تم اگر یہ سب کچھ شادی سے قبل جانتی تھیں تو اس کا اظہار تب کیوں نہیں

کیا......؟"

"آپ کی ہو جاؤں، اس وقت بھی اور اب بھی، میرے لئے یہی بڑا اعزاز ہے۔ میں نے اپنی قسمت پر رشک کیا، اسی لیے یہ بات چھپا گئی۔"

وہ ساری بات کہہ چکی تو محمود کی سمجھ میں بہت کچھ آ گیا۔

"کاش!تم نے مجھے پہلے بتایا ہوتا۔خیر، وہ اگر مجھ سے عشق کرتی ہے اور اس لیے ذیشان سے اس نے شادی نہیں کی تو وہ لاحاصل عشق میں مبتلا ہے۔تم جانتی ہو کہ اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔اب تمہارا کبھی اس سے رابطہ ہو تو اسے شادی کر لینے کا مشورہ دینا۔ اسے کہنا کہ یہ زندگی فقط ایک بار نصیب ہوتی ہے ،اسے لا حاصل جذبوں میں مت گنوائے۔" پھر چونک کر بولا۔"کہیں تم بھی تو یہی نہیں سمجھ رہی اور میری لاپرواہی کا مطلب......"

"ہاں ،محمود! میری سوچ میں یہ زہر گھل رہا ہے۔"

اس نے اعتراف کر لیا۔

"ایسا نہیں ہونا چاہیے اور تم جانتی ہو، اگر میرا اس سے کوئی تعلق ہوتا تو میں تمہیں بتا دیتا اور تم خود سوچو، کیا اسے حاصل کرنا میرے لئے مشکل تھا؟"

"میں سمجھ گئی لیکن میں اس پر معذرت نہیں کروں گی، میرے سامنے حالات ہی ایسے ہیں۔"

"بہر حال، آئندہ خیال رکھنا۔"

محمود نے اس کا ہاتھ پکڑ کر تھپتھپایا جو ان کے بیٹے کے اوپر تھا اور ان دونوں کے ہاتھوں کا سایہ ان کے بیٹے پر پڑ رہا تھا۔محمود نے محسوس کیا تو سحرش کو متوجہ کر کے بولا۔

"یہ جنید ہماری محبتوں کا گواہ ہے اور اب ہم نے اسی کے لئے جینا ہے۔"

"آپ مجھے کبھی بھی پیچھے نہیں پائیں گے۔"

اس رات جنید اور سحرش سکون سے سو رہے تھے۔ لیکن محمود کی آنکھوں سے نیند غائب ہو چکی تھی۔ شادی سے لے کر اب تک اس طرح کے سوال اور انکشافات ہو رہے تھے کہ اس کے اعصاب چیخ کر رہ گئے۔ جو تھوڑی بہت سکت اس میں تھی ، وہ اس

انکشاف نے سلب کر لی کہ صوفیہ اس سے جنون کی حد تک محبت کرتی ہے۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس نے کبھی سوچا تک نہیں تھا کہ وہ اس سے کوئی تعلق رکھے گا، وہ تو اس کی نظروں میں محض اس لئے معتبر ہوئی تھی کہ وہ بالکل چہرہ سے ملتی جلتی تھی اور اگر صوفیہ اسے پہلے مل جاتی اور چہرہ اس کے وجدان میں بعد میں آتی تو شاید وہ چہرے سے بھی انحراف کر لیتا یا وہ معتبر ہو جاتی اور چہرہ اپنی اہمیت کھو دیتا پھر وہ اپنا وجود اس چہرہ میں تحلیل کر دیتا، کچھ نہ کچھ اور ہی ہوتا لیکن اب جو صورت حال تھی اس میں جو کچھ بھی تھا، وہ صحیح نہیں تھا۔صوفیہ اسے چاہتی چلی آرہی ہے اور اس کے لئے خود کو تیاگ کر رکھ دیا۔ یہ ایک جھٹکا تھا۔ وہ سوچ کی جس پگڈنڈی پر بھی چلتا، گھوم کر یہاں آجاتا کہ ایسا کیسے ممکن ہے؟ وہ اگر اسے چاہتی ہے تو اپنی جگہ۔ اس نے تو کبھی اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی اور وہ بنا کسی اظہار کے اس قدر آگے بڑھ گئی کہ عشق کے سمندر میں بے خوف کود پڑی...... وہ سوچتا چلا گیا اور اس کے اعصاب چیخ کر اس کی ساری توانائیاں سلب کرنے لگے، بار بار اس کے ذہن میں یہی خیال ابھرتا کہ صوفیہ کو ایسا نہیں کر کرنا چاہئے، اسے اپنی دنیا میں مگن ہو جانا چاہئے ،مگر وہ محض سوچ سکتا تھا، کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ سوائے اس کے کہ اس پر ایک نیا بوجھ آن پڑا تھا۔

اگلی صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو دماغ میں نقش چند سوالوں کے سوا جیسے سب کچھ سلیٹ پر لکھے حرفوں کی طرح مٹ گیا، وہی چند سوال اس کے سامنے عفریت کی مانند کھڑے تھے...... چہرہ آخر کیوں اس کی زندگی کے ساتھ جڑ گئی ہے؟ اور اگر وہ اپنی زندگی میں اس کی حیثیت بنا ہی بیٹھا ہے تو اسے اپنی مرضی سے زندگی کیوں نہیں گزارنے دے رہی۔ وہ اگر جنسی جبلت کا پرتو نہیں ہے، تخلیقی وجدان یا قوت ہے تب پھر وہ وہاں تک محدود کیوں نہیں رہتی، اس کی زندگی کا دھارا کیوں موڑ رہی ہے۔ وہ دولت کمانا چاہتا ہے۔ ایک نام اور اپنی حیثیت بنانا چاہتا ہے۔ مگر وہ اسے جھنجھوڑتی ہے، ضمیر کی عدالت میں لا کھڑا کر دیتی ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ اور پھر صوفیہ! یہ کیوں اس وقت میری زندگی میں آ گئی جب میں انتہائی نازک موڑ پر شکستہ اعصاب کے ساتھ خود اپنے آپ سے جنگ کر رہا ہوں۔ وہ مجھ سے عشق کرتی ہے۔ تو کرتی رہے، اس وقت وہ کیوں اپنا بوجھ مجھ پر لاد رہی ہے۔ ایسے وقت میں جب میں اپنی زندگی کی شروعات اپنے انداز سے کرنا چاہتا

ہوں، کیوں میری راہ میں رکاوٹ بن کر آن کھڑی ہوئی ہے۔ ایک اپنے وجود اور دوسری وجدان کے ساتھ؟

"ارے، آپ ابھی تک بیدار نہیں ہوئے......"

سحرش کی آواز نے اسے چونکا دیا لیکن محمود کی نگاہوں میں نجانے کیا تھا کہ وہ اس کے پاس آ بیٹھی، پیار سے ماتھے پر ہاتھ رکھا تو چونک گئی۔ "آپ کو تو حرارت ہے۔ کہیں میری بات کو تو آپ نے......؟"

وہ کہتے کہتے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ جس میں شکوہ، التجا اور نجانے کیا کچھ ابھر رہا تھا۔

"وہ میرا باکس لاؤ۔ میں دیکھوں تو سہی حرارت ہے بھی یا نہیں؟"

اس نے ہلکے سے مسکرا کر کہا۔

سحرش اٹھی اور میڈیکل باکس دے کر باہر چلی گئی۔ محمود نے حرارت چیک کی اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اس کی ماما، جنید کو اٹھائے آ گئیں پیچھے ہی اس کے پاپا تھے۔

شام تک وہ اسی طرح مدہوش پڑا رہا۔ وہ جو اثر اس کی سوچوں سے اس کے وجود میں پھیل گیا تھا۔ اس کا علاج کڑوی گولیاں نہیں تھیں۔ اسے تو من کی شانتی چاہیے تھی۔ اسے پورا یقین تھا کہ سحرش خود کو موردِ الزام ٹھہرا رہی ہو گی کہ اس کی وجہ سے ہی ہوا ہے یا ہوسکتا ہے۔ وہ یہ گمان کرلے کہ اسی صوفیہ کے حالات جان کر اتنا دکھ ہوا کہ نوبت یہ آ گئی۔ کچھ بھی تھا۔ وہ مزید اس بارے میں اس کے ساتھ بات نہیں کرسکتا تھا جو اس کی بیوی، دوست اور زندگی کی ساتھی تھی۔

تین دن یونہی گزر گئے۔ اس کے دوست احباب بھی آ کر چلے گئے۔ وہ محض حوصلہ دے سکتے تھے۔ تیسرے دن اس کی حالت بھی خاصی سنبھل گئی تھی۔ اسی سہ پہر اس کے سٹاف میں شامل ادھیڑ عمر نرس کیتھرین فضل دین آئی، وہ کھلی ہوا بیٹھا ہوا تھا۔ کیتھرین عام سے گھریلو لباس میں تھی۔ وہ اس کی مزاج پرسی کے لئے آئی تھی۔ اس وقت سحرش اور اس کے پاپا بھی اس کے پاس تھے۔ کیتھرین نے چائے پینے کے دوران مسکراتے ہوئے کہا؛

"ویسے ڈاکٹر! ایک بات کہوں، آپ کچھ دن اور آرام کریں۔ بلکہ آپ کسی پرفضا مقام پر چلے جائیں۔"

"کیوں، مسز کیتھرین......؟"

پاپا نے جلدی سے پوچھا۔

"سر! اصل میں ڈاکٹر محمود بہت کام کرتے ہیں۔ اس عمر میں تو بندے کو تھوڑا لاابالی ہونا چاہئے، رنگوں سے، خوبصورتیوں سے الجھنا چاہئے اور میں دیکھتی ہوں کہ یہ ہر وقت مریضوں میں مصروف رہتے ہیں اور ان مریضوں میں تو ان کی دلچسپی حد سے زیادہ ہوتی جو مدد کے مستحق ہوں۔ یہ خود اپنے پاس سے بھی ان کے لئے خرچ کرتے ہیں۔"

"کیا یہ اچھی بات نہیں ہے، مسز کیتھرین......؟"

سحرش نے جلدی سے کہا۔

"اچھی بات ہے اور میرے خیال میں بہت اعلیٰ جذبہ ہے لیکن میں اکثر ان کو دیکھتی ہوں اور سوچتی ہوں کہ ان کے اندر کوئی قوت ہے ورنہ ایسا میں نے کبھی دیکھا نہیں۔ یہ کام کی زیادتی ہے جو یہ بیمار پڑے ہیں، انہیں تھوڑا سکون چاہئے...... کیوں ڈاکٹر محمود؟"

آخری لفظ کہتے ہوئے اس نے اپنی مخصوص مسکراہٹ سے سوال کر دیا، محمود کی توجہ اس طرف ہوئی اور اس نے سوچا کہ واقعی اسے چند دنوں کے لئے کہیں چلے جانا چاہئے۔

"وجہ بھی آپ نے بتا دی اور حل بھی، اب میں اس پر کیا تبصرہ کروں......؟"

تبھی پاپا نے کہا۔

"محمود واقعی تم کچھ دنوں کے لئے ایبٹ آباد اپنے انکل انور لطیف کے پاس چلے جاؤ، میں انہیں فون کر دیتا ہوں......"

"ٹھیک ہے، پاپا! میں چلا جاؤں گا...... شکریہ، مسز کیتھرین!"

اس نے کہا۔ پھر اسی موضوع پر ان کی باتیں چلتی رہیں۔

☆☆☆

دھوپ نے سردی کا احساس قدرے کم کر دیا تھا۔

نادیہ نے پورے گھر کو دھویا اور صاف ستھرا کر کے چمکا دیا۔ پھر نہائی اور گیلے بال سکھانے کے لئے چھت پر دھوپ میں جا بیٹھی۔ اس کی بچی اس کی ساس کے پاس تھی اور وہ صحن میں بیٹھی ہوئی تھی، تبھی اسے احساس ہوا جیسے صوفیہ آئی ہو۔ اس کا دل خوشی سے بھر گیا، اس نے منڈیر سے جھک کر دیکھا تو واقعی وہی تھی اور اس کی ساس کے پاس بیٹھی تھی۔ اس نے وہیں سے پکارا:

''صوفیہ اوپر آجاؤ..... اور امی، دو کپ چائے بھجوادیں اوپر.....''

کچھ دیر بعد صوفیہ اس کے پاس تھی۔

''بہت دنوں بعد آئی ہو.....''

نادیہ نے گویا گلہ کر دیا۔

''کالج سے آنے کے بعد بہت تھک جاتی ہوں اور تم بھی تو نہیں آئی اتنے دنوں.....''

''صوفیہ! گھر داری ایسی جاب ہے۔ جس کی مصروفیت کا تمہیں احساس نہیں''

نادیہ ایک گھر ہستن کے لہجے میں بولی۔ پھر مسکراتے ہوئے کہا: ''آج کوئی خاص بات ہی ہوگی جو تم ہمارے ہاں تشریف لائی ہو؟''

''بس یونہی جی الجھا ہوا تھا، تین دن سے کوشش کر رہی تھی کہ تمہاری طرف آؤں۔

''محمود کی کوئی تازہ غزل آئی ہے.....؟''

نہیں شاید اس نے شعر کہنا چھوڑ دیا ہے۔ پتہ نہیں وہ کس حال میں ہے، مجھے یوں لگتا ہے کہ وہ پریشان ہے۔''

''وہ پریشان رہے یا خوش، تمہیں کیا.....؟''

''یہ تم کہہ رہی ہو، نادیہ! تمہیں تو پتہ ہے۔ اب وہی.....''

''اب وہی کچھ نہیں ہے..... وہ اپنی زندگی میں مگن ہے، اپنا کیریئر بنا رہا ہے اور تم اس کے خیالوں میں جئے چلی جا رہی ہو۔ صوفیہ! اب اس کا خیال چھوڑ دو۔''

نادیہ نے جذباتی ہوتے ہوئے کہا تو صوفیہ یوں مسکرا دی جیسے کسی چھوٹے بچے کی بچکانہ ضد پر کوئی ہنس دے، پھر اس نے دھیرے سے کہا۔

''ابھی تو اس کا خیال آنا شروع ہوا ہے.....''

انجانے میں وہ ایک راز کہہ گئی۔ مگر شکر یہ ہوا کہ نادیہ اسے سمجھ نہ سکی۔

''کیا مطلب.....؟''

نادیہ نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''تم نہیں سمجھ سکو گی.....''

صوفیہ کی مسکراہٹ کچھ گہری ہوگئی۔

''ویسے ایک بات کہوں، حالانکہ تم میک اپ بھی نہیں کرتی ہو، لیکن اب بھی تم خاندان کی سب سے حسین لڑکی ہو۔ دن بدن نکھر کر مزید پرکشش ہوگئی ہو۔ میری مانو تو.....''

''تم اپنی بات نہ ہی منواؤ تو اچھا ہے۔ میں تو اتنا چاہ رہی تھی کہ کسی طرح پتہ کرو کہ محمود پریشان کیوں ہے؟''

''پھر وہی بات۔''

نادیہ نے الجھتے ہوئے کہا۔

''اچھا بابا، نہ پتہ کرو مگر لڑو تو نہیں.....''

صوفیہ نے کھوئے ہوئے لہجے میں سکون سے کہا۔

شاید نادیہ جواب دیتی مگر اتنے میں ان کی نوکرانی چائے لے کر آئی تھی یوں ان کا موضوع گفتگو ہی بدل گیا۔ لیکن کہاں تک، بات گھوم پھر کر محمود پر آ ٹکتی تھی۔

ڈھلتی شام نے جب لہو رنگ شفق پھیلا دی تب وہ چھت سے نیچے آئیں۔ کمرے میں آ کر نادیہ نے سحرش کو فون کر دیا۔ تب باتوں ہی باتوں میں اس نے محمود کے بیمار ہونے کی اطلاع دی۔ ریسیور رکھ کر نادیہ نے صوفیہ کی طرف غور سے دیکھا جو پرسکون چہرے سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اسے کیسے پتہ چلا محمود بیمار ہے اور پریشان ہے۔ اس کی ہمت نہ ہو سکی کہ اس بارے صوفیہ سے دریافت کرے۔ اس نے سحرش سے ہونے والی بات صوفیہ کو بتا دی، تبھی وہ اطمینان سے اٹھی اور بولی۔

"مجھے اس کیلئے دعا کرنی چاہئے....."

پھر وضو کر کے جائے نماز پر جا کھڑی ہوئی۔

☆☆☆

سردی کچھ زیادہ تھی۔ تاہم برف باری نہیں ہوئی تھی۔

یخ ہوا نے موسم میں شدت بھر دی تھی۔ انکل لطیف انور اور وہ ڈنر کے بعد آتش دان کے سامنے آن بیٹھے تھے...... سہ پہر کے بعد وہ ایبٹ آباد پہنچا تھا، پنڈی کے ہوائی اڈے سے ان کا ڈرائیور محمود کو لے آیا تھا۔ انکل گھر پر ہی تھے اور بہت تپاک سے ملے۔ لنچ لینے کے بعد وہ سو گیا اور اب وہ انکل کے سامنے بیٹھا، چائے کی چسکی لگا رہا تھا۔ جبکہ وہ سگار منہ میں دبائے کسی گہری سوچ میں گم تھے۔ انہوں نے گہری سانس لی اور مسکراتے ہوئے محمود کی طرف دیکھا اور بولے۔

"کیسا محسوس کر رہے ہو......؟"

"بہت اچھا...... میں ویسے بھی ٹھیک تھا لیکن سب نے کہا تو میں نے سوچا کہ تبدیلی لے لوں۔"

"ہوں......"

انہوں نے ہنکارا بھرا، پھر دھیرے سے مسکرا کر بولے۔ "تمہارے باپ میں اور مجھ میں کالج کے زمانے سے دوستی ہے۔ ہم نے عملی زندگی کا آغاز تقریباً ایک ہی وقت میں کیا تھا۔ ہماری دوستی تو تھی ہی لیکن پھر بعد میں دلچسپیاں اور مشغلے بھی مشترک ہو گئے۔ تمہارے باپ میں اور مجھ میں ایک فرق بہرحال رہا اور وہ یہ کہ اس نے پیسہ کمایا تو زندگی گزارنے کے لئے، بہت زیادہ لالچ میں نہیں پڑا۔ دھیرے دھیرے چلتا رہا بلاشبہ وہ اچھا اور با اصول بزنس مین ہے۔ مگر میں دولت کمانے کے لئے زندگی گزارتا

رہا۔ جس کا منطقی نتیجہ یہ ہوا کہ میں سکون کو ترس گیا اور اب سب کچھ چھوڑ کر یہاں زندگی گزار رہا ہوں۔ کاروبار میرے بچوں کے ہاتھ میں ہے اور وہی چلاتے ہیں۔'' انکل یہ کہہ کر چپ ہوگئے۔ محمود چائے پی چکا تھا اور پوری توجہ سے ان کی بات سن رہا تھا، کیونکہ اسے احساس ہوگیا کہ انکل انور نے اگر یہ بات شروع کی ہے تو ضرور اس کا مقصد ہوگا۔ وہ ہمہ تن گوش رہا۔ انہوں نے کوئی جواب نہ پاکر دوبارہ سگار سلگایا اور اس کی طرف بھرپور نظروں سے دیکھ کر بولے۔'' میں یہ سب کچھ تمہیں کیوں بتا رہا ہوں؟...... اس لئے کہ تم جان سکو، تمہارے باپ اور میرے درمیان کتنا گہرا تعلق ہے۔ اس نے مجھے تمہارے بارے میں بتایا اور اس دباؤ کو بھی معلوم کرنے کی بابت کہا ہے۔ جس کا شکار تم ہو لیکن بیٹا! نہ تو میں کوئی جاسوس ہوں جو الجھا کر باتیں اگلوانے کا ماہر ہوتا ہے اور نہ کوئی نفسیات دان۔ میں نے سیدھے سبھاؤ صاف بات بتا دی تمہارے باپ سے میرا تعلق اپنی جگہ مگر تمہارا اور میرا بھی تو ایک تعلق ہے۔ ہم دونوں مل کر اس مسئلے کا حل معلوم کرنے کی کوشش کریں گے۔ اگر کوئی ایسا مسئلہ ہے تو، جس کے بارے میں تمہارے باپ کا خیال ہے کہ تم دباؤ میں ہو۔ پورے اعتماد کے ساتھ بات کرو۔''

''انکل! آپ کا بہت شکریہ۔'' اس نے بڑے مودب لہجے میں صاف لفظوں میں کہا؛ ''میں واقعتاً دباؤ میں ہوں۔ آپ عملی آدمی ہیں اور آپ کے نزدیک شاید وہ بہت مضحکہ خیز باتیں ہوں لیکن پھر بھی میں آپ سے ضرور کہوں گا۔''

''بہت اچھی بات ہے، بیٹا! جہاں تک مضحکہ خیزی والا معاملہ ہے تو کوئی بات نہیں۔ وہ سنجیدہ نہ سہی، مضحکہ خیز سہی، بات تو ہے نا۔ تمہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ تم کہو میں سنوں گا۔ ہمارے پاس بہت وقت ہے کہنے کا اور سننے کا۔ اور ہاں، چائے منگواؤں؟''

''تھوڑی دیر بعد، انکل! ابھی مجھے نیند تو آئے گی نہیں۔ آپ اگر آرام......''

''نہیں، بیٹے! میں ہر وقت آرام میں ہوں......''

پھر اپنے ملازم کو آواز دے کر انہوں نے تھوڑی دیر بعد چائے لانے کا کہا۔ اس کے بعد محمود نے دھیرے دھیرے اپنی روداد کہنا شروع کر دی اس دوران چائے بھی

آگئی۔ انکل سگار پیتے رہے اور اس کی بات بڑے غور سے سنتے رہے۔ اس نے پوری دیانت داری سے سب کچھ کہہ دیا۔ جب اس کی بات ختم ہوئی تو انکل نے کلاک کی طرف دیکھا اور کہا؛

''اس وقت تقریباً چار بجنے والے ہیں، بیٹا! میں نے تمہاری باتیں سن لیں۔ فکر مت کرو، اب سو جاؤ۔ ہم کل صبح بات کریں گے۔''

یہ کہہ کر وہ اٹھ گئے تو وہ بھی اٹھ گیا۔ پھر دونوں چلتے ہوئے اپنے بیڈ روم میں چلے گئے۔

اگلی صبح خاصی چمکدار تھی، ہوا کو بھی سکون تھا۔ اس لئے موسم کی شدت کم ہوگئی تھی۔ محمود قدرے دیر سے اٹھا تھا۔ اس نے تازہ دم ہونے اور پھر ناشتہ کرنے میں خاصا وقت لیا۔ اسے معلوم ہوگیا تھا کہ انکل باہر لان بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ ان کے پاس چلا گیا۔ اسے دیکھتے ہی انہوں نے اخبار میز پر رکھ دیا اور بولے۔

''آؤ بیٹا! نیند کیسی آئی......سکون سے تو سوئے نا؟''

''جی انکل! بہت سکون سے گہری نیند سویا ہوں۔''

''بہت اچھا......'' یہ کہہ کر کچھ دیر موسم کی باتیں کرتے رہے پھر بولے۔''ہوں تو جناب، میں نے سوچا ہے تمہارے مسئلے کے بارے میں۔ برخودار! یہ تو کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔''

''کیسے انکل......''

''ایسے کہ جس طرح کبھی کبھی آگہی بہت زیادہ بوجھ بن جاتی ہے، اسی طرح لا علمی بھی انسان کو توڑ کر رکھ دیتی ہے۔ میں تمہیں بچپن سے جانتا ہوں لیکن کچھ عرصہ تم میری نظروں سے اوجھل بھی رہے ہو۔ اس دوران میں نہیں جانتا کہ تمہاری عادات کیا رہی ہیں، جیسا کہ تم نے کہا کہ تم سگریٹ نہیں پیتے، شراب کو کبھی ہاتھ نہیں لگایا اور سب سے بڑی بات کہ تم نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ میں اسے بالکل درست اور سچ مانتا ہوں۔ ہوسکتا ہے کوئی دوسرا کہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی بندہ اس قدر صاف و شفاف ہو، مگر میں مانتا ہوں کہ تم بالکل سچ کہہ رہے ہو اس کی وجہ......لیکن ٹھہرو، ہم ایک چھوٹا سا تجربہ

کرتے ہیں۔" یہ کہہ کر انکل نے میز پر دھرے ہوئے شیشے کے شفاف گلاس کو لیا اور اپنی جیب سے پین نکال کر کھولا اور گلاس میں رکھ دیا۔ پین کا ذرا سا سرا باہر تھا۔ پھر محمود کی طرف دیکھ کر وہ بولے۔" یہ میں جو تجربہ کرنے جارہا ہوں، ابتدائی کلاسوں میں بچوں کو کرواتے ہیں۔ ان کی نصابی کتابوں میں موجود ہے۔ اسے پروفیکشن کہتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ گلاس کی طرف متوجہ ہوئے۔" یہ گلاس اور یہ پین بالکل اصلی حالت میں نظر آرہے ہیں نا!"

"جی، بالکل......"

اس نے کہا تو انکل نے اس گلاس میں پانی ڈال دیا۔

"اب دیکھو...... وہ پین جو سیدھا تھا۔ اب ٹیڑھا نظر آرہا ہے جبکہ تمہیں یقین ہے کہ پین سیدھا ہی ہے۔ بڑا بڑا بھی نظر آرہا ہے۔ جبکہ پین اتنا ہی ہے...... ٹیڑھا اور بڑا کیوں نظر آرہا ہے؟ اس گلاس میں موجود پانی کی وجہ سے، یعنی یہ پانی کچھ نہ کچھ ہے۔"

"جی بالکل، پانی کی وجہ سے...... یہ انعکاس و انعطاف کا عمل ہے۔"

"اب سمجھو، یہ گلاس وجود ہے۔ روح اور پین قوت ہے۔ اب دیکھو...... پین سے سیاہی نکل کر اس پانی کو گدلا کررہی ہے۔ کچھ دیر بعد یہ پورے پانی کو سیاہ کردے گی۔"

انکل چپ ہو گئے۔ پین کی سیاہی سے پانی گدلا ہوتا گیا یہاں تک کہ پین نظر آنا بند ہو گیا۔

"دیکھو بیٹا! اب پین نظر نہیں آرہا ہے۔"

"واقعی نظر نہیں آرہا ہے......"

"یہی حقیقت انسان کی ہے۔ وہ صاف و شفاف بدن لے کر پیدا ہوتا ہے اور اس میں زندگی کی ٹھوس حقیقتیں اس قلم کی طرح ہوتی ہیں۔ پانی وہ ماحول ہے جو انسان کو میسر آتا ہے۔ جب ایسی صورت حال ہو تو ساری قوتیں انسان کے من پر آشکار ہو جاتی ہیں، دیکھنے والے کو وہ قلم ہی نظر آئے گا لیکن گلاس یا انسان کے من کی ساری

چیزیں اس پر عیاں ہیں کہ وہ کیسی ہیں۔ پھر جیسے جیسے من میں سیاہی گھلتی ہے۔ سب کچھ چھپ جاتا ہے...... بیٹا! تمہارا چہرہ، تمہاری اپنی قوت ہے۔ یہی بات اگر تم کسی بدھ لامہ یا مونک سے کہو تو وہ پکار اٹھے گا کہ تم میں بدھا کی روح حلول کر گئی ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں، تمہارا من صاف تھا جو تمہیں یہ نعمت میسر آگئی ورنہ گوتم بدھ کے پیروکار کیا کچھ نہیں کرتے اس نعمت کو حاصل کرنے کیلئے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر عام انسان بھی محض اپنے آپ کو شفاف کر لے تو گوتم بدھ جیسا گیان تو کیا، روحانیت کے اعلیٰ مدارج آسانی سے طے کر جائے گا۔ روحانیت تو انسان کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ خیر اس وقت گوتم کا نروان یا روحانیت ہمارا موضوع نہیں۔" انکل یہ کہہ کر چپ ہو گئے پھر سگار سلگا کر بولے۔" اب اسی بات کو ہم دوسری طرف سے دیکھتے ہیں...... تم نے کبھی دیکھا یا سنا ہوگا کہ نیند کی حالت میں انسان دنیا کے ان خطوں میں جا پہنچتا ہے جن کے بارے میں نہ کبھی سنا اور نہ کبھی دیکھا۔ یہ سب کیا ہے؟ یہ سب لاشعور کی طاقت ہے۔ جب انسان کا رابطہ شعوری قوتوں سے ہٹ کر لاشعور کی دنیا سے ہوتا ہے تو پھر انکشافات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ کبھی محسوس کیا کہ کوئی واقعہ تمہارے سامنے وقوع پذیر ہوا اور تمہیں لگا کہ ایسے تو پہلے بھی ہو چکا ہے...... ان باتوں کو بھی چھوڑو۔ یہ سوچو ذہن میں جب جھاڑ جھنکاڑ بھرے گا تو اس کا منطقی نتیجہ کیا ہوگا؟ تم سوچو کہ ایک کمرہ ہے۔ اس میں اگر کاٹھ کباڑ ہے، مٹی، دھول، بدبو ہے تو کیا وہاں سکون ہوگا؟ جبکہ کسی سازوسامان کے بغیر صاف ستھرے ہوادار کمرے میں جانا ہو، جہاں بظاہر خوبصورتی نہ ہو لیکن سکون وہاں بہر حال ہوگا۔ یہی ذہنی سکون، خوبصورتیاں تخلیق کرنے کا باعث بنتا ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ انسانی ذہن کی تراش خراش ہی اصل مدعا و مقصد ہے۔ تمہارا چہرہ ایک قوت ہے۔ تمہارے لاشعور کی خوبصورتی ہے۔ اب تم اسے سطحی طور پر شاعری میں گنوا دو یا پھر اس سے کوئی عظیم کام لے لو۔ وہ قوت، وہ خوبصورتی تمہاری راہیں خود متعین کر رہی ہیں۔ تم نے اپنی منفی سوچ کی سیاہی سے اپنے من کو گدلا کرنے کی کوشش کی تو نتیجہ توڑ پھوڑ نکلا۔ وہ اگر تمہیں خدمت انسانیت کا درس دیتی ہے تو یہی تمہارا اصل کام ہے، یہی وجدان ہے، یہی گیان ہے، یہی نروان اور عرفان ہے۔" وہ خاموش ہو گئے۔ ان کا سگار بجھ چکا

تھا، انھوں نے پھر سلگایا۔ محمود ان کی باتوں میں یوں محو تھا جیسے جکڑ لیا گیا ہو۔ وہ پھر مسکراتے ہوئے بولے۔ ''بیٹا! میں اس کا حل تیسری طرح بھی دے سکتا ہوں۔ ان دیکھی قوتوں کی باتیں کرکے یا ایسی روایات سنا کر جن کا ٹھوس ثبوت کسی کے پاس نہیں ہوتا۔ البتہ وہ زبردست انداز میں اپیل ضرور کرتی ہیں۔ فی الحال اتنا ہی کافی ہے۔ اسے سوچو، سمجھو اور غور کرو۔ تم خود سمجھ دار ہو''۔

''میرے ذہن میں یہ خوبصورت عورت ہی کے روپ میں کیوں آئی۔ یہ قوت یا خوبصورتی کسی اور طرح سے، اور شکل میں......؟''

''تم مرد ہو بیٹا! اور جو مرد ہوتا ہے، عورت ہی اس کے لئے کشش کا باعث ہوسکتی ہے، وہی تم سے باتیں کرسکتی ہے اور اصل میں اس خوبصورتی کا جو کام تھا، وہ اسی روپ میں ممکن تھا۔ محبت جذبہ ہی ہے نا اور جذباتی کوشش سے ہی ممکن ہو پاتا ہے۔ پھر ہوسکتا ہے کہ ایک چیز مجھے خوبصورت لگ رہی ہے، تمھیں نہ لگے تمہارے اندر ہی خوبصورتی کا یہی روپ تھا، جو سامنے آیا......''

''انکل! ایک بات اور...... کیا چہرہ کی صوفیہ سے مشابہت محض اتفاق ہوسکتا ہے۔''

''نہیں بیٹا! یہ اتفاق نہیں بلکہ تمہارے لاشعور کی کارفرمائی ہے۔ تم نے کبھی نہ کبھی اسے پہلے ضرور دیکھا ہوگا۔ بچپن میں، وہ تمہاری یادداشت پر چسپاں ہوگئی اور پھر یہ تمہارے لاشعور کی قوت ہے۔ جس نے اسے وہی روپ دیا جو قدرت نے صوفیہ کو دیا ہے۔''

''ایسا ممکن ہے، انکل......؟''

''کیوں نہیں...... اس کے گواہ تم خود ہو اور اس کی کئی مثالیں ہیں۔''

''انکل! ایک اور سوال...... میں اپنے من میں خود اپنا گواہ ہوں کہ میں نے صوفیہ کو کبھی نہیں چاہا لیکن وہ میری محبت میں اپنی تمام تر خوشیاں تیاگ کئے بیٹھی ہے، صرف میرے نام پر جینا چاہتی ہے۔ پہلی تو بات ہے کہ ایسا کیونکر ہوا؟ میں نے تو کوئی کوشش تک نہیں کی، نہ اس کے بارے میں کبھی سوچا اور نہ کبھی ایسی خواہش کی......؟''

''تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ تم نے کبھی کچھ نہیں کیا......''

''انکل! میں سچ کہتا ہوں کہ......''

''ٹھہرو، میں تمہیں سمجھاتا ہوں...... یہ ہوا ہے نا جس میں ہم سانس لے رہے ہیں، کتنی شفاف نظر آرہی ہے لیکن تم یہ بھی جانتے ہو کہ اس میں کتنی ساری مقناطیسی لہریں تیر رہی ہیں۔

ریڈیو کی، ٹیلیویژن کی، کسی ٹرانسمیٹر کی یا پھر فون کی لہریں۔ اب وہ نظر نہیں آرہی ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس میں لہریں ہیں۔ ٹیلی ویژن کی لہر کو ریڈیو نہیں پکڑتا اور جس ریڈیو اسٹیشن سے نکلتی ہے، ریڈیو اس چینل پر ہوگا تو آواز برآمد ہو جائے گی ورنہ نہیں۔ ریڈیو اسٹیشن پر بولنے والے اناؤنسر کو نہیں پتہ کہ کس کے ریڈیو پر جا کر اس کی آواز ابھرے گی، البتہ اسے معلوم ہوگا کہ جو ریڈیو اس کے چینل پر ہوگا۔ وہاں آواز ضرور ابھرے گی۔ تمہارے ساتھ بھی ایسا ہوا ہے۔ تم چہرہ سے محبت کرتے ہو، شدت سے، عشق کی حد تک، تم ایک ریڈیو اسٹیشن کی مانند ہو، جہاں سے محبت کی لہریں خارج ہوئیں، وہی چہرہ تمہارے وجود سے باہر بھی تھا، اسے ضرور متاثر ہونا تھا۔ وہ جونہی تمہارے چینل پر آئی تو لہریں......''

انکل یہ کہہ کر مسکرا دیئے۔

''انکل! پھر تو جب تک چہرہ ہے۔ یہ سلسلہ چلتا رہے گا؟''

''نہیں، بیٹا! میرے خیال میں چہرہ کچھ عرصے بعد تمہارا ساتھ چھوڑ دے گا۔''

''وہ کیسے......؟''

''اس کی دو وجوہات ہیں۔ پہلی وجہ چہرہ ہے، وہ تمہیں جو راستہ دکھا رہی ہے۔ اسے سمجھنے کی کوشش کرو۔ وہ تمہیں انفرادی دنیا سے نکال کر اجتماعی دنیا میں داخل کر رہی ہے۔ اس دور میں جبکہ انسان کی انسان سے نفرت ایک حقیقت بن چکی ہے۔ تمہیں محبت کی قوت دے کر، اعتماد کی طاقت دے کر، تمہیں انسانوں سے جوڑ کر اپنا مقصد پورا کر رہی ہے۔''

''اور دوسری......''

''دوسری وجہ صوفیہ ہے۔ جب تک اس نے تمہارا پیار اپنے من میں نہیں بسایا

تھا۔ اس وقت تک وہ کچھ بھی نہیں تھی۔ وہ اپنے اندر منفی جذبات کے باعث گدلی تھی۔ لیکن جب اس نے تمہارا پیار پایا۔ اس نے اپنی کثافت دور کرنا شروع کر دی۔ گدلے شیشے کو ریاضت سے شفاف کر لیا جائے تو اپنا آپ ہی نہیں بہت کچھ صاف نظر آنا شروع ہو جاتا ہے۔ اس کی تمام تر توجہ کا مرکز اب تم ہو۔ اس کی دعائیں بھرپور قوت رکھتی ہوں گی۔ ایسا ہونا ایک حقیقت ہے۔ تمہارا طرز تو ایک ریڈیو ٹرانسمیشن کی طرح تھا۔ جس میں محض آواز ہوتی ہے۔ تصویر نہیں، اس کی توجہ سیٹلائٹ وژن کی طرح ہے۔ جو تصویر بھی دکھاتا ہے۔ یہی ارتکاز کا منطقی نتیجہ ہوتا ہے۔ جس میں چہرہ جذب ہو جائے گا۔"

"کیا میں اپنی زندگی چہرہ کے دیئے ہوئے ٹریک پر گزار دوں گا......"

"نہیں...... پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ تمہارے اندر کا اپنا ٹریک ہے۔ دوسری بات کہ انسانی زندگی میں بے شمار ایسے واقعات، حادثات اور تجربے آتے ہیں جنہیں اگر موتی سمجھ لیا جائے تو زندگی ایک ڈوری ہے۔ جس میں انہوں پرو دیا جاتا ہے، ہر تجربہ، ہر نیا تجسس زندگی کی دلیل ہے۔ جب تم انسان سے جڑ جاؤ گے تو تمہارے سامنے اس قدر وسیع کائنات کھل جائے گی جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے اور جب تم......" ابھی وہ کچھ اور کہتے کہ مین گیٹ سے ایک گاڑی اندر آتی دکھائی دی، انکل اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ "اوہ، یہ تو راجہ قدوس ہے۔ میرا دوست۔" پھر محمود کی طرف متوجہ ہو کر بولے۔ "اکثر گپ شپ کے لیے آجاتا ہے۔ آج ہماری اتنی ہی باتیں کافی ہیں، باقی پھر سہی۔ خوب انجوائے کرو۔"

اسی شام ڈنر کے بعد وہ پھر بیٹھے۔ ادھر ادھر کی گپ شپ کے دوران وہ کافی پیتے رہے، تب محمود نے کہا۔

"آپ کی ساری باتیں میں سمجھ گیا۔ چہرہ کیا ہے، صوفیہ سے اس کی مشابہت کیوں ہے، کیا چاہتی ہے، لیکن ایک بات سمجھ نہیں آتی۔"

"وہ کیا؟" انکل نے پوچھا

"آخر یہ میرے اندر سے نیا وجود کیسے بن گیا۔ اس کی کوئی نہ کوئی توجیہہ تو ہوگی؟"

"توجیہہ نہیں بیٹا......! یہ حقیقت ہے۔ یہ قوت، یہ وجود صرف تمہارے تمہارے

اندر ہی نہیں۔ ہر انسان کے اندر موجود ہے۔ تمہیں اس لیے پتہ ہے کہ یہ تم پر آشکار ہوگیا۔ اب سمجھو یہ کیسے حقیقت ہے۔" انکل نے رک کر اپنا جلتا ہوا سگار بجھایا اور ایک طرف رکھتے ہوئے بولے۔ "ایک حدیث مبارکہ میں آیا ہے کہ انسان کے ساتھ پیدائش کے وقت ایک جن شیطان پیدا ہوتا ہے اور وہی اس کا جسم لطیف ہوتا ہے۔ اس پر صحابہؓ نے وجہ تخلیق کائناتﷺ سے دریافت کیا کہ آپﷺ کے ساتھ وہ جن شیطان پیدا ہوا ہے؟ آپﷺ نے فرمایا کہ ہاں میرے ساتھ ایک شیطان پیدا ہوا ہے، لیکن میرا جن شیطان مسلمان ہو گیا ہے۔ یہ ہوئی ایک توجیہہ۔ دوسری توجیہہ، میرے پیارے یہ ہے کہ جدید علوم میں تم نے مسمیریزم یا ہپناٹزم وغیرہ کے بارے میں سنا ہوگا۔ اس کا عامل اپنے معمول کو زبردستی نیند سلا دیتا ہے۔ پھر وہ کس سے باتیں کرتا ہے؟ اس کے اندر موجود جسم سے باتیں ہوتی ہیں۔ یورپ میں اس علم کا ایک نیا نام بھی ہے، جسے سپر چولزم کہتے ہیں اور مشرق میں ہمزاد وغیرہ......"

انکل نے دھیرے دھیرے اپنی بات مکمل کی اور بجھا ہوا سگار اٹھالیا۔

"آپ نے میرے تمام سوالوں کے جواب دے دیئے اور ضمنی سوال خود بخود ختم ہو گئے آپ کے خیال میں مجھے اب کیا کرنا چاہیے......؟"

"بچے اپنے اندر کی آواز کو پہچانو، کائنات سے اپنا رشتہ جوڑو۔ انسان سے محبت کرو۔"

یہ کہہ کر وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئے پھر بولے۔

"یہ بات ہے تو قبل از وقت لیکن بہتر ہوگا کہ تم صوفیہ کی محبت اور وہ سب کچھ جو اس کی جانب سے تمہارے نام ہے اور جسے تم بوجھ سمجھ رہے ہو، اسے بھی اتار پھینکو۔ ورنہ ایک دن آئے گا، جب تم خود سمجھو گے کہ تم بے کار بوجھ لئے پھرتے رہے ہو۔ میں اس بوجھ کو اتار دینے کی بات اس لیے کر رہا ہوں کہ کل جب تمہیں احساس ہوگا کہ تمہارا بوجھ اس نے اتار دیا ہوا ہے تو پھر تمہیں خواہ مخواہ اپنی مشقت پر افسوس ہوگا۔"

"انکل......! وہ کیسے؟"

"اب تم چاہو بھی تو اسے اپنی محبت سے باز نہیں رکھ سکتے۔ وہ محبت کی لذت

سے آشنا ہوگئی ہے اور ابھی اس کی راہ میں اور مقام بھی ہیں۔ جنہیں اس نے طے کرنا ہے۔ اس کے لئے اب تمہارا وجود، تمہاری شخصیت نہ ہونے کے برابر ہے۔ تم صرف اس کی توجہ کا مرکز یا وسیلہ ہو۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اسے چاہے کسی بھی وقت آزما لینا۔“

انکل نے یہ کہہ کر گویا بات ختم کر دی تھی۔

محمود وہاں ایک ہفتہ رہا۔ اس دوران ادھر ادھر خوب سیر کرتا رہا۔ انکل سے لمبی لمبی باتیں چلتی رہیں۔ وہ ان کی باتوں کے نئے نئے پہلو تلاش کر کے سمجھنے کی کوشش کرتا رہا اور پھر واپس اپنے شہر آگیا۔ وہ اپنے آپ میں ایک نئی امنگ محسوس کر رہا تھا۔ وہ دباؤ اب اس پر نہیں تھا۔

☆☆☆

وہ زندگی سے بھرپور لمحے تھے۔

محمود اپنے کھچڑی ہوتے ہوئے بالوں میں ہاتھ پھیرتا ہوا ڈیپارچر لاؤنج میں داخل ہوا۔ وہ حکومتی سطح کے ایک سیمینار میں شرکت کیلئے دارالحکومت آیا تھا۔ مسلسل دو دن کی تھکان اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ اس کے ہاتھ میں ہلکا بریف کیس تھا۔ وہ بڑے سکون سے ایک سیٹ پر بیٹھ گیا اور تبھی وہ چونک گیا۔ اس سے ذرا فاصلے پر چہرہ تھی۔ اس کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ اتنے سالوں بعد وہ اسے دکھائی دی تھی اور اس سے بے اعتنائی برت رہی تھی۔ بالکل اجنبی لگ رہی تھی، وہ اسے دیکھ کر مسکرا دیا اور اس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہا، کچھ وقت گزار ہوگا کہ چہرہ نے گردن گھمائی اور اس کی طرف دیکھا۔ وہ بھی حیرت سے چونک گئی۔ وہ چند لمحے دیکھتی رہی، پھر اٹھ کر اس کی طرف بڑھ آئی۔ وہ مسکراتے چہرے کے ساتھ اسے دیکھتا رہا۔

”السلام وعلیکم!...... پہچانا مجھے......؟“

آواز، لہجہ اور چہرہ بدلا بدلا سا تھا۔ محمود کو شک سا ہوا پھر کھچڑی بالوں پر نظر پڑی تو حیرت زدہ رہ گیا۔ چہرہ تو ایسی نہیں تھی۔ تو کیا صوفیہ ہے؟

”نہیں پہچان پائے آپ......؟“

اس نے پھر کہا تو محمود کو جیسے ہوش آگیا، خوشگوار انداز میں اس نے کہا۔

”بالکل پہچان لیا، صوفیہ آؤ بیٹھو۔“ اس نے اپنے ساتھ خالی سیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

”شکر ہے، پہچان لیا ورنہ میں تو سمجھی تھی کہ آپ میرا چہرہ بھول گئے ہوں

گے۔"

"صوفیہ! تم کوئی بھولنے والی ذات ہو...... یہاں کیسے؟"

"کچھ سرکاری کام تھے اور آپ......؟"

"سیمینار تھا یہاں پر......"

"کیسے ہیں آپ...... بچے کیسے ہیں؟"

"ٹھیک ہیں، سحرش بھی ٹھیک ہے۔ تین بیٹے اور ایک بیٹی ہے، سب ٹھیک ہیں۔"

"الحمدللہ......! میرے خیال میں، آپ نے جس شے کی بھی اب تک خواہش کی ہے۔ وہ آپ کو مل گئی۔"

"ہاں...... میں اسپیشلائزیشن کے لئے باہر چلا گیا اور پھر مصروفیت کی انتہا ہوگئی۔ اب کہیں جا کر سکون ہوا ہے۔ ہاں میں نے جو چاہا مجھے ملا۔ صوفیہ! تم نے اچھا نہیں کیا، شادی نہ کر کے تم......"

"میرے لئے شادی کی کوئی اہمیت نہیں رہی اور اگر میں شادی کر لیتی تو میرے بہت سارے پراجیکٹ وجود میں ہی نہ آتے، جواب چل رہے۔ میں اب بہت ساری لڑکیوں کی کفالت کر رہی ہوں۔ کئی لڑکیوں کے گھر بسانے کی توفیق میرے اللہ نے مجھے دے دی ہے۔ بہت سارے لوگوں کی خدمت میرے اللہ نے میرے سپرد کر دی ہوئی ہے۔ ان کی دیکھ بھال میرے ذمے ہے اور میں بے حد پرسکون ہوں۔ مجھے وہ روحانی سکون میسر ہے، جو بہت کم لوگوں کو میرے اللہ کی طرف سے عطا ہوتا ہے۔"

صوفیہ نے کچھ اس انداز سے کہا کہ وہ کتنی ہی دیر کچھ نہ کہہ سکا، شاید ان دونوں کے درمیان مزید بات ہوتی مگر اسی خاموشی کے دوران جہاز کی روانگی کا اعلان ہو گیا۔ وہ دونوں ہی خاموشی سے اٹھ گئے۔ جہاز میں ان کی سیٹیں آگے پیچھے تھیں، دونوں میں سے کسی نے بھی کوشش نہ کی کہ اکٹھے بیٹھ جائیں۔ محمود اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ وہ پرسکون تھا۔ کوئی اور بات کرنے کی اس کے دل میں ذرا بھی خواہش نہیں تھی۔ اسے لگا جیسے ان دونوں کے وجود الگ الگ ہیں۔ لیکن روحیں کہیں دور، بہت دور ایک ہو چکی ہیں۔ اس نے سکون سے آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆